مرتب : سید علی عباس جلالپوری

آخر کیوں؟

صنوبر انیس برس کی ایک حساس اور ذہین لڑکی تھی۔ شکل و صورت کے اعتبار سے وہ اپنی سہیلی گلرخ کے الفاظ میں "اجنتا کے غاروں کی ایک مورتی" تھی۔ جب وہ ننھی سی کھلنڈری بچی تھی تو سوءِ اتفاق سے وہ ایک حادثے کا شکار ہو گئی اور اُس کے چہرے کا چ[illegible] کٹ گیا۔ اس واقعے نے صنوبر کی زندگی کے سرچشمے کو یکسر مکدر و مسموم کر دیا۔ جب اُس نے شباب کی طوفان پرور وادی میں قدم رکھا تو ایک طرف اُسے آتش گیر ارمانوں اور پرجوش تمناؤں نے گھیر لیا دوسری طرف اُس کے احساسِ کمتری میں عذاب ناک تلخی پیدا ہو گئی جس سے اُس کے ذہن و قلب ایک دلدوز کشمکش کی آماجگاہ بن گئے۔ ایک مدت گزری صنوبر نے راقم حروف سے نفسیاتی مشورہ کیا تھا۔ راقم نے کہا کہ وہ ہر روز گوشۂ تنہائی میں بیٹھ کر اپنے برجستہ خیالات و احساسات کو قلم بند کر لیا کرے۔ اسی روزنامچے کے چند اوراق کا جو بڑی شستہ و رفتہ انگریزی میں لکھے گئے تھے، اردو ترجمہ پیش کیا جاتا ہے۔ راقم نے پاروں کی ترتیب میں کہیں کہیں خفیف سا ردّ و بدل کیا ہے لیکن اصل متن کو جوں کا توں رہنے دیا ہے۔ نام و مقام البتہ مصلحتاً بدل دیے گئے ہیں۔

صنوبر کی تحریر خود نگارش، احتسابِ نفس اور غور و فکر کا ایک اچھا نمونہ ہے۔ اس کی جراحتِ احساس، حرماں نصیبی، روحانی ذہنی کشمکش اور عذاب ناک جذباتی خلفشار کے بے محابا اظہار و بیان نے اس تحریر کو ایک قابلِ قدر انسانی دستاویز اور ایک بلند پایہ ادب پارہ بنا دیا ہے۔

ان اوراق کا ترجمہ کرتے وقت راقم یہ سوچتا رہا کہ وہ بھاری صلیب جو کسی عظیم المیے کے ہیرو کے مضبوط کندھوں کو شکستہ کر سکتی تھی کیوں ایک نازک اندام لڑکی کے ناتواں کندھوں پر رکھ دی گئی ——— آخر کیوں؟

---

(۱)

گلرخ چاہتی ہے میں تفصیل سے اس بات کا ذکر کروں کہ میری بدصورتی کی ابتدا کیسے ہوئی۔ اب میں کیا کہوں۔ بس ہونی تھی ہو گئی۔ ابا جان اور امی جان ہر وقت آپس میں لڑتے جھگڑتے رہتے تھے۔ اپنی اپنی ضد نبھاتے تھے مجھے نظر انداز کر دیا گیا تھا۔ جب یہ حادثہ رونما ہوا تو ہر کوئی دوسرے کو ذمے دار گردانتا تھا۔ ابا جان نے ایک راسخ العقیدہ مسلمان کی طرح کہا "اللہ کی رضا یہی تھی"۔ پھر امی جان آنسو بہاتی رہیں اور ابا جان دوڑے دوڑے ڈاکٹر کے پاس گئے لیکن سب کوششیں رائیگاں گئیں۔ میرے مقدر میں یہی کچھ لکھا تھا۔ میں کئی دفعہ ابا جان اور امی جان سے جھگڑی ہوں کہ جب یہ حادثہ ہوا تو آپ نے میرا گلا کیوں نہ گھونٹ دیا۔ سات برس کی بچی کو جان سے مارنا آسان تھا لیکن انیس سال کی لڑکی کو مارنا مشکل ہے۔ میرے والدین پکے مسلمان ہیں، وہ مجھے کیسے جان سے مارتے۔

خوش نصیبی سے میں ایک ذہین اور حساس لڑکی تھی۔ مجھے یوں لگتا ہے جیسے عام حسیات کے علاوہ اور بھی کئی حسیں مجھے قدرت نے دی ہیں۔ امی جان، ابا جان سے الگ رہتی تھیں لیکن مجھ سے انھیں بڑا لگاؤ تھا۔ انھوں نے مجھے کیمبرج اسکول میں داخل کرا دیا۔ انھیں اندیشہ تھا کہ عام مدرسے میں بچے طعن و طنز سے میری جان ضیق میں کر دیں گے، اور میں احساس کمتری کی شکار ہو جاؤں گی۔ سکول میں سبھی مجھے چاہتے تھے۔ ایک دن ایک لڑکی اور لڑکے نے مجھ سے پوچھا "تمھیں کیا ہوا تھا؟" اُن کا ایک بڑا بھائی بھی موجود تھا، اُس نے انھیں ڈانٹ دیا۔ مجھے ابھی تک یاد ہے کہ اُس کے ہونٹوں پر ندامت آمیز مسکراہٹ کا سایہ کانپ رہا تھا۔ ہمارے دوست بہت تھے اور ہم سب مل کر گیت گایا کرتے تھے۔ ایک گیت ہم نے خود گھڑ رکھا تھا جس کا ابتدائی مصرع تھا "آؤ بچھڑے والی پکڑیں" اب میں اُسے بھول چکی ہوں۔ مجھے یاد ہے کہ ایک دن میں نے خواب میں دیکھا کہ میں اور میرا ایک ہم جماعت فیاض ایک دوسرے کے بازو میں بازو ڈالے جا رہے تھے۔ میں حیران ہوں کہ میں نے یہ خواب کیوں دیکھا تھا کیونکہ فیاض سے میری چنداں بے تکلفی نہیں تھی۔ ایک دن ہم سب لوگ فلم دیکھنے گئے۔ اور میرے ساتھ ابا جی نے کہا تھا "تمھیں فلمیں نہیں دیکھنی چاہئیں، تمھاری بینائی کو ضرر پہنچے گا۔" ابا جان ہمیں اپنے پاس رکھنا چاہتے تھے لیکن وہ اُس لڑکی تمناز کے زیر اثر تھے۔ چنانچہ انھوں نے یہ خیال ترک کر دیا۔ بہرحال جیسے بھی تھے ہم خاصے خوش و خرم تھے۔ میں، صبیحہ اور ایک لڑکا پرویز سکول سے چھٹی ہونے پر باغ میں کھیلا کرتے تھے۔ صبیحہ ابھی بہت چھوٹی تھی۔ لیکن میں اور پرویز ہاتھوں میں ہاتھ ڈالے بے تحاشا بھاگا کرتے تھے۔ میں پڑھائی لکھائی میں اچھی خاصی تھی۔ مجھے یاد ہے کہ ایک دفعہ رشید ہمارے ہاں آیا تو اس نے میرا سر سہلایا اور جب وہ اپنے ایک دوست ناصر سے ملنے گیا تو مجھے بھی ساتھ لے گیا۔ اس سے پہلے بھی وہ مجھے بائیسکل پر بٹھا کر سیر کے لئے جایا کرتا تھا۔ میں اس کی گود میں بیٹھ کر اسے گانا سنایا کرتی تھی۔ اس وقت اُس کی عمر پندرہ سولہ برس کی تھی اور وہ ہائی سکول میں پڑھتا تھا۔ وہ میری کہانیوں اور بے تکان گفتگو سے بہت محظوظ ہوا کرتا۔

میں ابھی نو برس کی تھی کہ مجھے لگا جیسے میں بڑی ہو رہی ہوں۔ ایک دفعہ ہم شادی پر گئے۔ رشید ابھی ابھی ملازم ہوا تھا۔ شادی پر ہمیں قیمتی لباس بنوا کر نہیں دیئے گئے تھے جس سے مجھے خاصی کوفت ہوئی تھی۔

جب ہمارے ابا جان نے تمناز سے اپنا تعلق منقطع کر دیا تو میری سوتیلی ماں کو اپنے یہاں لے آئے اور پھر دو برس کی جدائی کے بعد ہمارے ہاں پہنچے۔ وہ دسمبر کی ایک رات تھی غضب کا جاڑا تھا۔ امی جان نے انھیں کھڑے کھڑے گھر سے نکال باہر کیا۔ اس وقت رات کے دس بجے ہوں گے۔ بعد میں انھوں نے بتایا تھا کہ ریل کے انتظار میں انھیں چار گھنٹے تک سٹیشن پر ٹھٹھرنا پڑا تھا۔

میں ناولوں کو بہت پسند کرتی تھی۔ یہ شوق پریوں کی کہانیوں سے شروع ہوا تھا۔ امی اتنی کتابیں فراہم نہیں کر سکتی تھیں اس لئے مجھے ناولیں خریدنا پڑتیں۔ امی مجھے روپیہ پیسہ کچھ نہیں دیتی تھیں اور مجھے ناولوں کا شوق کھائے جا رہا تھا۔ مجبوراً مجھے امی جان کے پرس سے رجوع ہونا پڑا۔ ان دنوں میں پیسے چرانے کے نئے نئے طریقے اختراع کیا کرتی۔ دھڑکتے ہوئے دل کے ساتھ چوری کرتی اور بھاگ جاتی۔ آخر امی جان کو واقعی کھٹکا ہوا۔ انھوں نے مجھے پکڑ کر خوب ٹھکائی کی۔ میں رسالوں اور قصے کہانیوں کی کتابوں کے لئے ادھر اُدھر گھوما کرتی۔ موقع ملنے پر کھیتوں کی سیر کو بھی نکل جاتی جس پر مجھے بے بھاؤ کی پڑتی تھیں۔ کبھی کبھی مجھے چلچلاتی دھوپ میں بیٹھنے کی سزا دی جاتی۔ جب امی جان کہیں جاتیں اور مجھے سائے میں بلاتیں تو میں ایسی ہٹ دھرم تھی کہ وہیں جگہ سے نہ ہلتی۔ امی جان میرے ہاتھوں کو جلایا بھی کرتی تھیں تاکہ میری چوری کی عادت چھوٹ جائے لیکن میرا جواب یہی تھا کہ جب یہ کسی طرح سے نہیں دیتیں تو میں ایسا ہی کروں گی۔ میرا ایک محبوب مشغلہ یہ تھا کہ میں چماروں کی بچیوں سے بہناپا کر لیتی اور انھیں سہیلیاں بناتی تھی۔

مجھے اپنی گیارھویں سالگرہ یاد ہے جو بڑی دھوم سے منائی گئی تھی۔ امی جان کی سہیلیوں نے مجھے کیا اچھے اچھے تحفے دیئے تھے۔ ان دنوں مجھے سکول جانے سے نفرت سی ہو گئی۔ میں اور صبیحہ سکول کے وقت مکان کی چھت پر جا کر چھپ جاتیں اور جب امی چلی جاتیں تو نیچے اتر کر کھیلا کرتیں۔ صبیحہ بڑی جھگڑالو

تھی۔ وہ اوپری تھی بچیوں کے ساتھ کھیلتی کودتی چلی جاتی اور کسی نہ کسی درخت پر دیہاتیوں سے لسی لے کر بیٹھتی اور روٹی کھاتی تھی۔ ان دنوں امی جان اور ابا جان میں صلح ہو گئی۔ اور وہ ہمارے یہاں آنے جانے لگے۔ آٹھویں جماعت میں تھی کہ میں سکول سے بیزار ہو گئی۔ میں لاپروا تھی اور استانی جی مجھے بہت سخت سست کہا کرتیں مجھے کھانا پکانا سینا پرونا نہیں آتا تھا۔ جو لڑکیاں ان کاموں میں برتر تھیں اُن کے سامنے مجھے شرمندہ ہونا پڑتا تھا۔ میں تیرہ برس کی تھی کہ اچھی خاصی جوان دکھائی دینے لگی۔ میں نے آٹھویں جماعت کے امتحان میں وظیفہ لیا تھا۔

میری ایک سہیلی تھی صفیہ نام تھا۔ اس کا بڑا بھائی جس کا سیاہ فام چہرہ حبشیوں جیسا تھا مجھ میں دلچسپی لیتا تھا۔ صفیہ میری بڑی اچھی سہیلی تھی اور مجھ سے بڑی محبت کرتی تھی۔ شاید اس لئے بھی کہ میں اسے انگریزی اور ریاضی میں مدد دیا کرتی تھی۔ ایک دن اُس نے مجھ سے کہا "منور! اگر تم اتنی بدصورت نہ ہوتیں تو میں تمہاری شادی بھائی جان سے کرا لیتی۔" میں نے اس کی طرف دیکھا اور کہا تم ٹھیک کہہ رہی ہو۔

کہتے ہیں کہ تاریخ اپنے آپ کو دہراتی ہے۔ میری بدصورتی کا قصہ اتنی بار دہرایا گیا ہے کہ مجھے اس سے گھن آنے لگی ہے۔ اب اس کی تکرار کو ختم ہونا چاہیے ورنہ کسی روز چیخوں گی ـــ اس زور سے چیخوں گی کہ یا اپنا سر پھوڑوں گی یا دنیا کو تہ و بالا کر کے رکھ دوں گی۔

نویں جماعت میں بہت کچھ سنبھل گئی تھی۔ اور میری قابلیت کا بھی شہرہ ہونے لگا تھا۔ تیرہ برس کی عمر سے ہی میں نے گھر والوں سے لڑنا جھگڑنا شروع کر دیا تھا۔ اب گھر پر میرا تسلط قائم ہو گیا تھا۔ امی جان بھی میری قابلیت کے باعث مجھے بہت چاہنے لگی تھیں۔ باہمی محبت اور احترام کا یہ تعلق آج تک بحال ہے۔ اگرچہ میری زندگی کے راستوں پر بعض اوقات وہ مجھے سخت سرزنش کرتی ہیں اور میں بھی خواہ مخواہ اپنے مشورے اُن پر ٹھونستی رہتی ہوں۔ مجھے امید ہے کہ یہ تعلق اسی طرح بحال رہے گا۔

اب مجھ پر ایک نئی دھن سوار ہوئی ـــ فلمیں دیکھنا اور فلمی رسائل پڑھنا۔ میں نے بھی بڑی سینکڑوں فلمیں دیکھی ہوں گی اور میری معلومات ایکٹروں، ایکٹرسوں، موسیقی کے ہدایت کاروں، فلمی شاعروں، افسانہ نویسوں کے متعلق خاصی وسیع ہو گئیں۔ اس کے ساتھ میں بڑی باقاعدگی سے ریڈیو سیلون سنتی تھی۔ ایکٹروں اور ایکٹرسوں کی عکسی تصاویر سے میں نے کئی مرقعے تیار کئے۔ امی جان کو میرا یہ شغل ایک آنکھ نہیں بھاتا تھا۔ وہ کہتی تھیں کہ اس میں روپے کا بھی نقصان ہے اور وقت کا حرج بھی ہوتا ہے۔ جب میں نے سنی ان سنی کر دی تو انھوں نے میرے مرقعے جلا دیئے۔ طیش سے میرا خون کھول اٹھا اور میں نے اپنا سر دروازے کے ستون سے دے مارا جیسا کہ پاگل سر پھوڑتے ہیں۔ اور دو دن تک نہ کچھ کھایا نہ پیا۔ ابا جان نے مجھے ایک کیمرہ خرید دیا تھا۔ اب میں عکسی تصاویر کے مرقعے تیار کرنے لگی۔ امی جان اس شوق کے بھی خلاف تھیں لیکن رفتہ رفتہ پسیج گئیں۔ مجھے فلمیں دیکھنے کا جنون تھا۔ میں وہ فلمیں پسند کرتی جن میں دلدوز المیہ جذبات کا اظہار کیا جاتا تھا۔ اس قسم کی فلمیں دیکھ کر میں رات بھر شرربار جذبات میں جلتی بھنتی تھی۔ مجھے فلمی تکنیک کی بھی کچھ سوجھ بوجھ ہو چلی تھی۔ اور فلم سازی، موسیقی اور عکاسی میں بھی بصیرت پیدا ہو گئی۔ حقیقی تاثر کیا ہوتا ہے۔ حقیقت نگاری کسے کہتے ہیں۔ کون سے مقام پر کیسے مضحک سستی جذباتیت پیدا ہو جاتی ہے۔ یہ سب کچھ مجھے معلوم تھا۔ اپنے حلقۂ تعارف میں مجھے فلمی نقاد سمجھا جاتا تھا۔ میں ایک فلمی کی طرح ناک سکوڑ کر اور حلق سے غر غر کی آواز نکال کر منہ پر ہاتھ رکھ کے جذباتیت سے اپنی بیزاری کا اظہار کیا کرتی۔ اب میں معروضی انداز سے اپنے آپ کو دیکھتی ہوں تو معلوم ہوتا ہے کہ سستی جذباتیت سے متنفر ہونے کے باوجود میں خود بعض اوقات اس کی شکار ہو جاتی ہوں۔

بارہ برس کی عمر ہی میں وہ جاگتے خواب دیکھنے لگی جو کسی لڑکی کو نہیں دیکھنے چاہئیں۔ مجھے حقائق کی علمی بصیرت میسر آ جاتی تو شاید میں خواب و خیال کی دنیا میں کھو کر نہ رہ جاتی۔ میں روز خوابی میں پُر مسرت حسین دنوں کے تصورات میں غرق رہتی۔ اس سے میری صحت پر ناخوشگوار اثر بھی پڑا۔ میں پہروں ایک جگہ بیٹھی جاگتے خواب دیکھا کرتی جن کو ناکامی، محرومی اور ناداری کے واقعات جنم پہنچاتے تھے۔ میں لاکھ ان خوابوں سے پیچھا چھڑانے کی

کوشش کرتی لیکن میں ابھی تک ان سے گلو خلاصی نہیں کرا سکی ہوں۔ لگتا ہے جیسے وہ میری رگ و پے میں سرایت کر چکے ہیں۔ اس طرح بیکار بیٹھے رہنے سے میری صحت بگڑ گئی اور میرا جگر خراب ہو گیا۔ دسویں جماعت میں مجھ پر اس تلخ حقیقت کا انکشاف ہوا کہ جیسی کہ میں اپنے آپ کو خوابوں میں دیکھا کرتی تھی فی الحقیقت ایسی نہیں تھی۔ اس حقیقت کو قبول کر لینا تمام خوابوں سے دست بردار ہونا تھا اور یہ بات میرے لیے ناممکن تھی کیونکہ وہ مجھ پر چھا چکے تھے۔ یہ احساس بڑا وحشت انگیز تھا۔ میرے دل کا چین ختم ہو گیا۔ سکول میں میری ایک سہیلی تھی، رشیدہ نام تھا۔ ایک دن اس نے مجھے بتایا کہ نوجوان لڑکی کے نام پر مرتے ہیں انھیں اس بات سے چنداں غرض نہیں ہوتی کہ وہ بدصورت ہے یا خوبصورت۔ یہ تو محض موم کی گڑیا ہوتی ہیں۔ میں گہری سوچ میں پڑ گئی۔ کیا میں محض ایک لڑکی تھی؟ بچہ اور بچی تھی۔ میرے ذہن میں ایک خاکہ سا ابھرا۔ میں نے سوچا میں کہاں ہوں؟ میں کیا ہوں؟ لوگ مجھے کیا خیال کرتے ہیں؟ کیا میں کسی سے محبت کر سکتی ہوں؟ کیا میرے اندر جنس قسم کی کوئی چیز ہے؟ جنس تو کیا ہے؟ اور اس سے مراد کیا ہے؟

دسویں جماعت کے امتحان کی تیاری میں میں نظر بندی سی رہنے لگی اور میرے چہرے کا رنگ زردی مائل ہو گیا۔ ایک شخص ہمیں دودھ دیا کرتا تھا۔ اس کی لڑکی کا نام سکینہ تھا اور وہ آٹھویں جماعت میں پڑھتی تھی۔ وہ میرے پاس انگریزی پڑھنے آیا کرتی تھی۔ ایک دن میں دروازے سے تھکی اور بستر پر لیٹی تھی کہ وہ آئی اور پھر منہ واپس چلی گئی۔ شام کے وقت وہ پھر آئی اور کہا: میں تو آپ سے ملنے آئی ہوں۔ میرا جی چاہتا ہے کہ سوتے میں آپ کا منہ چوم لوں۔ وہ یہ بات بڑی سنجیدگی سے کہہ رہی تھی۔ میں بھونچکا سی رہ گئی۔ کیا میرے اندر مردانگی پائی جاتی ہے؟ یہ خیال میرے لیے حیرت اور صدمہ پیدا کرنے کا باعث ثابت ہوا اور میں اپنی گفتگو اور طور طریقوں سے اپنے آپ کو ایک نوجوان ظاہر کرنے لگی۔

سکول سے فارغ ہونے پر مجھے کالج میں داخلہ مل گیا۔ میں اپنی ہم جماعتوں کے سامنے شرم و حجاب کے مارے بول نہ سکتی تھی لیکن ابا جان سے خوب جھگڑا کرتی تھی۔ میری اور ابا جان کی حالت ایسے رقیبوں جیسی تھی جو ایک دوسرے کی تمدد کرتے ہیں۔ سوال وہی فرسودہ تھا مجھے محبت اور ہمدردی کی ضرورت تھی اور اس کے ساتھ میں اپنی ذات کے لیے کامل آزادی کی خواہاں بھی تھی۔ ابا جان پابندیاں عائد کرنے کے حق میں تھے اور مجھ سے قطعی لاپروا تھے۔ ابا جان کی عدم موجودگی میں میں ان سے محبت کیا کرتی تھی لیکن ان کے قریب آ کر میں نے محسوس کیا کہ وہ لاابالی، ضدی اور بے رحم ہیں۔ سارا طلسم شکست ہو گیا۔ میں اپنی امی جان کا سہارا لینا بھی ناپسند کرتی تھی۔ وہ بھی آخر میری طرح عورت ہی ہیں اور ابا جان میری پروا نہیں کرتے تھے۔ مجھے یوں لگا جیسے دنیا فریب نگاہ ہے، غیر حقیقی ہے۔ قدرتاً استدلال کی صورت کچھ یوں بن گئی کہ اگر وہ چیز جس کی میں طالب ہوں اور جس سے میں محبت کرتی ہوں غیر حقیقی ہے تو وہ چیزیں جن سے مجھے نفرت ہے اور جن سے میں صرف نظر کرنا چاہتی ہوں کیوں حقیقی ہیں؟ وہ خواہ مخواہ کیوں ٹھوس مستقل اور مضبوط ہیں؟ مصیبت یہ ہے کہ میرے ذہن میں بیسیوں طبیعیاتی اور ما بعد الطبیعیاتی مسائل جمع ہو گئے ہیں جن کا حل مجھے نہیں سوجھتا۔ کالج میں جا کر میں خاصی کامیاب ثابت ہوئی لیکن حسین، رنگین اور شوخ و شنگ لڑکیوں کے جھرمٹ میں مجھے اپنا آپ بڑا حقیر و صغیر دکھائی دیا اگرچہ میں جانتی ہوں کہ انھیں قریب سے دیکھنے پر ان کی اصلیت بخوبی آشکار ہو جاتی ہے۔

میں حیران ہوں کہ ذہنی انقلابات کے باوجود مجھ میں حماقت پن کے آثار کیوں باقی رہ گئے ہیں۔ اردو اور تاریخ کی لیکچرار مجھے پسند کرتی تھیں مجھے فلسفے کی کلاسیں کا بے حد شوق تھا لیکن فلسفے کی لیکچرار عام قسم کی بے رنگ خاتون تھیں۔ یہی وجہ ہے کہ میں فلسفے سے بدظن ہو گئی۔ جدید مغربی تاریخ کے سیاسی انقلابات میں مجھے خاصی دلچسپی تھی۔

ابا جان کی بے پروائی نے مجھے مجبور کر دیا کہ میں آنٹی کو اپنا مربی سمجھنا شروع کر دوں۔ ہم زندگی کے مختلف مسائل پر تبادلۂ خیالات کرتے تھے جس میں زیادہ وہ باتیں میں ہی کرتی تھی۔ میرے خیال میں مجھے ہر وقت ضرورت محسوس ہوتی ہے کہ میں اپنے جذبات کا اظہار کرتی رہوں۔ اس کے

بغیر میں شاید اپنے حواس بھی کھو بیٹھوں گی۔ نعیمہ نے سچ کہا تھا تم اپنے پیٹ میں کوئی راز نہیں رکھ سکتیں۔ جس نے تمہیں اپنا ہمراز بنایا اس نے اپنی موت کا پروانہ لکھا۔ یا تو اس طرح میں ہر وقت اپنی موت کا پروانہ آپ ہی لکھتی رہتی ہوں لیکن راشد نے اس بات کا ناجائز فائدہ اٹھایا مجھے شروع سے جبلی طور پر عجیب اور غیر معمولی بات سے دلچسپی رہی ہے۔ راشد نے میری باتوں کو حقیقی معنی پہنانے شروع کر دیئے جب کہ وہ بخوبی جانتا تھا کہ جو معنی وہ لیتا ہے وہ میرا مقصود نہیں ہوتے۔ مصیبت یہ ہے کہ لوگ مجھے ہمیشہ غلط سمجھا کرتے ہیں شاید اس لئے کہ اظہار و بیان میں میرے اصل خیالات مسخ ہو جاتے ہیں۔ میں اپنے خیالات کے اظہار سے قاصر رہتی ہوں اور جو الفاظ نوک زبان پر آتے ہیں ان سے سخت چڑ جاتی ہوں اور حیران ہوتی کہ کیا کہوں۔

ایک دن ایک صاحب ہمارے یہاں آئیں اور مجھ سے پوچھا "آخر تمہیں ہوا کیا تھا؟" میں کچھ جواب نہ دے سکی اور حیران تھی کہ کیا کہوں انھوں نے ترس کھاتے ہوئے کہا "الٰہی توبہ! آنکھوں کی وضع کیسی عمدہ تھی!"

(۲)

اس جذباتی فشار کو دور کرنے کے لئے شاید کسی نہ کسی قسم کا اظہار ضروری ہو گیا ہے۔ میں محسوس کرتی ہوں کہ اگر میں نے اس بوجھ کو جس کے نیچے میرا ذہن و قلب دب کر رہ گیا ہے، نہ بٹایا تو میں کسی کام کی بھی نہیں رہوں گی۔

آج کئی واقعات پیش آئے۔ صبح سویرے اچھی بھلی تھی۔ دوپہر کے قریب مجھ پر افسردگی سی چھا گئی۔ میری کلائی کی گھڑی کھو گئی ہے۔ اچھی خاصی قیمتی تھی۔ ہر شخص سے پسند کرتا تھا۔ وہ میری رفیقہ بن گئی تھی۔ میں نے اسے کھو دیا ہے۔ اس ہفتے مجھے کئی نقصانات اٹھانے پڑے۔ خدا معلوم ابھی کیا کچھ دیکھنا ہے۔

نقشے کی کلاس میں میری طبیعت ناساز ہو گئی۔ تھکن اور چکر سا محسوس ہونے لگی۔ لڑکیوں کے چلے جانے کے بعد مجھے اپنی تنہائی اور کس مپرسی کا ایسا اذیت ناک احساس ہوا کہ مجھے یوں لگا کہ جیسے دل میں گوشت اور لہو کی بجائے خلا سا رہ گیا ہے۔ میں نے اپنے آپ کو سنبھالنے کی کوشش کی۔ میرے وقار و تمکنت کے احساس نے میری آنکھوں سے امڈتے ہوئے آنسوؤں کو روکنے کی کوشش کی۔ میں اپنی جگہ سے اٹھنا چاہتی تھی لیکن میرے گھٹنے کانپ رہے تھے بڑی مشکل سے اٹھی۔ لگر ریٹ جانے کی سکت کہاں تھی۔ جماعت کے کمرے میں گئی اور کرسیوں پر لیٹ گئی۔ تھوڑی دیر بعد اٹھ کھڑی ہوئی۔ میں نے اپنے منہ کو ہاتھ سے مضبوطی سے تھاما لیکن پھر آنسو بے اختیار میرے گالوں پر ڈھلک پڑے۔ میں نے اپنے آپ سے کہا "میری طبیعت بڑی ناساز ہے" پھر شال اور کتابیں اٹھا آہستہ آہستہ بوجھل قدم اٹھاتی گھر کی طرف چلی۔ دہلیز پر قدم رکھتے ہی مجھے خیال آیا کہ میں دیر سے آئی ہوں۔ آخر کتنی دیر ہوئی؟ کلائی کی طرف دیکھتی ہوں تو گھڑی غائب۔ واپس جانے کی ہمت نہ پڑتی تھی۔ بہر صورت ملازم کو ساتھ لے کر کالج گئی لیکن گھڑی کا سراغ نہ ملا۔ ڈیوٹی کو اطلاع دے کر گھر لوٹ آئی۔ مجھے اس بات کا بڑا رنج تھا کہ امی جان ضرور خفا ہوں گی لیکن امی جان نے بڑی نرمی اور ملاطفت سے میری دلجوئی کی جس سے میرے سینے پر سے ایک بوجھ اتر گیا۔ کئی دنوں سے میں بہت کم کھا رہی تھی۔ بھوک ہی نہیں ہوتی تھی۔ آج باورچی خانے میں جا کر آدھی چپاتی اور ایک ابلا ہوا انڈا کھایا۔ چائے پی اور قلم اٹھا کر لکھنا شروع کیا۔ مجھے ایک تقریر بھی تیار کرنی ہے۔ میرا ارادہ ہے کہ دو ہفتوں کے وقفے کے بعد مطالعہ بھی شروع کروں لیکن میرا جی ہے کہ بیٹھا جا رہا ہے۔

(۳)

اس وقت پونے تین بجے ہیں۔ صبح دس بجے سے میں کرب ناک درد محسوس کر رہی ہوں۔ اب درد سے افاقہ ہے۔ مجھے اکثر محسوس ہوا ہے کہ علالت کے دوران میرا دماغ زیادہ روشن ہو جاتا ہے اور شعور زیادہ بیدار رہتا ہے۔ مجھے ابھی ابھی یاد آیا ہے کہ سیاسیات پر بحث کرتے ہوئے میرا گورنمنٹ کے ساتھ مناظرہ ہو گیا۔ وہ بخوبی جانتی ہے کہ وہ شخص جو محض بحث کا سہارا لیتا ہے اپنے موقف کو کمزور کر لیتا ہے۔ میں کشمیر کے مسئلے کی اہمیت

سے بخوبی واقف ہوں اور گذشتہ چھ ماہ سے اخبارات کا بھی باقاعدگی سے مطالعہ کر رہی ہوں لیکن بدقسمتی سے میری دلچسپی اس شخص کی سی ہے جو شطرنج کی بازی دیکھ رہا ہو۔ میں دنیا کے احوال کو ذاتی مسئلہ بنا کر نہیں دیکھ سکتی ہیں اپنی فطرت سے مجبور ہوں اور محض مباحثے کی خاطر گل رخ سے اختلاف رائے کرتی ہوں تاکہ مجھے اس کے خیالات کا علم ہو جائے۔ جہاں تک مذہب کا تعلق ہے مجھے اس پر کامل اعتقاد ہے لیکن میرے لاشعور میں شکوک و شبہات کروٹیں بدلتے رہتے ہیں۔ آخر خدا نے مجھے عنصریاتی پہلو سے کیوں ایک مکمل انسان نہیں بنایا؟ میرے اندر ہر چیز کے متعلق ہزاروں پہلو پیدا ہو جاتے ہیں۔ میں حیران ہوتی ہوں کہ مجھے خلق کرتے وقت خدا سنجیدہ بھی تھا کہ نہیں۔ نہیں پیئے ہوئے تھا۔ یہ میں نہیں کہہ رہی۔ میرے لاشعور کی گہرائیوں سے ایک شریر بھتنے نے سر اٹھایا اور یہ بات کہہ دی۔

فضا میں بہار کی خوشبو پھیل رہی ہے۔ بہار کی آمد آمد ہے۔

پھر آج کس قدر خود نما اور شگفتہ خوری ہے۔ وہ میرے قریب کھڑی کہہ رہی تھی اخاہ! مجھ سے بھی کیا حماقت ہوئی آج تو میری صرف ایک ہی گھنٹی لگے گی۔ باقی سارا وقت کالج میں بیکار گذرے گا۔ مجھے چاہیئے تھا کہ مصوری کا سامان اٹھا لاتی۔ مجھے جتنی نفرت بناوٹ سے ہے اور کسی چیز سے نہیں ہے۔

(۴)

مجھے ابھی ابھی یاد آ رہا ہے کہ ایا جان نے ایک دن مجھ سے کہا تھا "تم ایسی دکھائی دیتی ہے جیسے

سارے جہاں کا درد ہمارے جگر میں ہے

آج گل رخ نے تقسیم ملک کے خوفناک اور دلدوز واقعات سنائے۔ وہ نہیں جانتی کہ اس کی باتیں سن سن کر میرا جگر گیا چاک ہو گیا تھا۔

گل رخ کہتی ہے کہ مجھے راشد کی بات مان لینی چاہیئے تھی لیکن میں ایک شرمیلی لڑکی تھی اور مجھے اس کی بہت سی باتیں پسند بھی نہیں تھیں۔ وہ متکبر، جوشیلا، ہوس کار اور اخلاق سے قطعی بے بہرہ تھا۔ میں ہر چیز کو برداشت کر سکتی ہوں لیکن بداخلاقی سے سمجھوتا کرنا میرے بس کی بات نہیں ہے۔ میں نے ایک مذہبی ماحول میں پرورش پائی ہے۔ اس لئے کسی ایسی بات کو گوارا کرنا جس میں بداخلاقی کا شائبہ تک بھی ہو میرے لئے امر محال ہے۔ ایسے شخص سے اظہار محبت کرنا جو میرا شوہر نہیں بن سکتا گویا اس شخص سے بددیانتی کرنا ہے جس سے میری شادی ہو گی۔ میں کسی کو دغا نہیں دے سکتی اور مجھے ظاہرداری سے نفرت ہے لیکن میری بات کون مانے گا۔ اس کے سامنے مجھے شرم محسوس ہوتی تھی۔ دوسروں کے نزدیک میری شرم و حیا بے معنی ہے۔ مجھ سے کون ہمدردی کرے گا۔ آخر میں اتنی گھبرا کیوں جاتی ہوں؟ جب کبھی کوئی شخص میری جانب دیکھتا ہے تو مجھے دانتوں پسینہ آ جاتا ہے۔ کیا میں اس گھبراہٹ پر قابو پا سکتی ہوں؟ اس حالت میں تو میں ہکلانے لگتی ہوں۔ شرم سے پانی پانی ہو جاتی ہوں میں کسی مرد کی گھورتی ہوئی نگاہوں کی تاب نہیں لا سکتی۔ اس سے مجھے تکلیف اور بیزاری محسوس ہونے لگتی ہے۔

مجھے ایک کتاب شروع کئے دو ہفتے گذر چکے ہیں۔ کاش کہ میں مطالعہ میں غرق ہو سکتی۔

آج کالج سے لوٹی تو امی جان نے سخت سرزنش کی کہ میں کیوں کالج کی تقریبات میں حصہ نہیں لیتی۔ مجھے ہر وقت کتابیں نہیں پڑھنی چاہئیں۔ یوں اپنا وقت ضائع کرنا چاہیئے۔ میں حیران ہوتی ہوں کہ مجھے وقت کے گذرنے کا احساس کیوں نہیں ہوتا۔ اب جبکہ میری گھڑی کھو گئی ہے یہ بات اور بھی مشکل ہو گئی ہے۔ میں بستر میں لیٹ گئی۔ میرا سر چکرا رہا ہے۔ مجھے اپنے آپ پر اعتماد نہیں رہا۔ میں اپنے آپ کا سہارا نہیں لے سکتی۔ لیکن اس کے سوا چارہ بھی کیا ہے؟ میری سہیلیاں میرا مذاق اڑاتی ہیں۔ کیا حقیقتاً میں کسی قابل نہیں ہوں؟ مجھے ہر کہیں نقصان اٹھانا پڑتا ہے۔ لوگ مجھ پر رحم کھاتے ہیں لیکن مجھ سے محبت نہیں کر سکتے۔ میں نے کتنی اچھی گھڑی کھو دی ہے۔ میں کس قدر لاپرواہ ہوں۔

میرے دل میں عجیب و غریب، تند و تیز جذبات مچلتے ہیں اور کئی سوال ابھرتے رہتے ہیں۔ کیا میں کسی قابل ہوں؟ کیا میں کوئی کام انجام دے سکتی ہوں؟ کیا میرا کوئی مقام ہے؟ مجھے یوں لگتا ہے جیسے میں چاروں طرف سے نفرت و حقارت میں گھِر گئی ہوں۔ شاید زمین بھی میرا بوجھ اٹھانے سے قاصر ہے۔ مجھے ہر کہیں اور ہر چیز میں بیگانگی اور اجنبیت کا احساس ہوتا ہے۔

(۵)

امّی جان مجھ پر اور جمیلہ پر چار بجے سہ پہر سے لے کر آٹھ بجے شب تک تُن تُن کرتی رہیں۔ جمیلہ پر خفگی کا سبب یہ تھا کہ وہ مطالعے میں غفلت برت رہی ہے اور مجھ پر اس لئے ناراض تھیں کہ میں کئی دنوں سے بے قاعدگیاں کر رہی ہوں۔ امّی جان کو یہ بات زیب نہیں دیتی۔ وہ دونوں غیظ و غضب میں چپ چاپ کھولتی رہتی ہیں۔ جب یہ طوفان ٹوٹ پڑتا ہے تو شعلہ گیر لاوے کی طرح ہر چیز کو فنا کر کے رکھ دیتا ہے۔ خدا جانے میرے اندر کون سی بات ہے جو مجھے گستاخی پر اکساتی ہے۔ امّی جان نے مجھے نوکر اور لڑکیوں کے سامنے ڈانٹ بتائی۔ اگر وہ ضبط اور شفقت سے کام لیتیں تو میں ان کے ہر حکم کے سامنے سرِ تسلیم خم کر لیتی۔ اگر وہ کہہ دیتیں "صنو، رہیار ہی، پھر کبھی کالج سے آنے میں دیر نہ کرنا" یا "کالج کی تقریبات میں شرکت کرنے سے احتراز کرنا" یا کوئی غیر معمولی اقدام کرنے سے پہلے مجھے باخبر کر دینا" تو میں اپنا سر جھکا دیتی لیکن جب وہ کہتی ہیں "تم نے ایسا کیوں کیا؟ تم لاعلاج ہو" تو قدرتاً میرے ہونٹوں پر بھی جواب آ جاتا ہے "کسی کو مجھ سے بازپرس کا حق نہیں پہنچتا۔ میں جو چاہوں گی کروں گی۔" بس اس سے زیادہ میں کچھ بھی سننا نہیں چاہتی۔ میں نہیں جانتی کہ ایسے وقتوں میں کیا چیز میرے حلق کو جلاتی ہوئی ابھر آتی ہے۔ یہ میرے اندر انقلاب کی آواز ہے۔ اپنے ابا جان کی غضبناک روح ہے جو ہمیشہ من مانی کرتے ہیں۔ فرق صرف یہ ہے کہ مجھے پیار سے رام کیا جا سکتا ہے۔ جمیلہ ابھی تک روٹھی بیٹھی ہے۔ اس نے کوئی چیز نہیں کھائی۔ کل رات سے امّی جان اسے منا رہی ہیں۔

کل رات میں نے لسّی منگوا کر پی جس سے میں تر و تازہ ہو گئی اور میرے دل میں جو سوزش ہو رہی تھی وہ بھی رفع ہو گئی۔ البتہ پشت میں ہلکا سا درد باقی ہے۔ دریچے سے مسلسل باہر دیکھتے رہنا میرا محبوب مشغلہ ہے۔ میں پہروں اس کے سامنے بیٹھی باہر دیکھا کرتی ہوں۔

(۶)

پونے چھ بجے ہیں۔ میں اڑھائی بجے سے بستر میں لیٹی پڑی ہوں۔ میں شاید قلم ہاتھ میں نہ لیتی لیکن عابدہ نے مجھے ایک بات اس انداز سے کہی کہ میں کچھ پریشان ہو گئی۔ اس نے کہا "تمہاری بہن کہاں داخلہ لے رہی ہے؟ یہاں تو صرف عام قسم کی لڑکیاں ہی پڑھتی ہیں۔ تمہاری بہن آپ ہے۔ تمہیں ہے، میں جانتی ہوں وہ ایسے کالج میں داخلہ لے گی جو اس کی شان کے شایاں ہو گا۔" یہ سن کر میرا سر چکرانے لگا۔ آخر یہ لوگ کیوں فرض کر لیتے ہیں کہ میں بدصورت ہونے کی وجہ سے اس کالج میں پڑھ رہی ہوں۔ ممکن ہے یہ بات کسی حد تک صحیح بھی ہو۔ مجھے ایسے ماحول سے نفرت ہو گئی ہے جہاں لوگ اس قدر ظاہر داری اور تصنع سے کام لیتے ہیں۔

میں شروع سے ہی اپنے بزرگوں کے لئے ایک عُقدہ بنی رہی ہوں۔ مجھے لوگوں سے ملنے ملانے سے سخت نفرت ہے اور میں اس کوشش میں کبھی کامیاب نہیں ہو سکی۔ دوسرے لوگوں کی صحبت میں بدمزہ ہو جاتی ہوں۔ پبلک سکول میں رہ کر میں بہت کچھ رد و اصلاح ہو گئی تھی لیکن وہاں کی فضا سے بھی مجھے نفرت تھی۔ تمام طلبہ، اُن کا انداز گفتگو، ان کا لباس اور رنگ ڈھنگ امریکیت کے سانچے میں ڈھل چکے ہیں۔ معاشرتی ملاقات میں ان کا رویہ اس قدر کاروباری تھا کہ مجھے کہیں بھی کوئی صادق اور مخلص دل نہ مل سکا اور میں مایوس ہو گئی۔ اتنا ضرور ہوا کہ میں اپنے گھر میں دلچسپی لینے لگی اور مہمانوں سے گھل مل کر باتیں کرنے لگی۔ شروع شروع میں کام چل گیا لیکن مجھے اس بات کا سان گمان نہیں تھا کہ مجھے اپنے خلوص کی اتنی گراں قیمت

ادا کرنا پڑے گی اور جن سے اخلاص رکھوں گی وہ اتنا مجھ سے نفرت کرنے لگیں گے۔

(۷)

اس وقت تین بجے ہیں۔ میں اپنے بستر میں آرام سے بیٹھی ہوں اور اس سوچ میں ہوں کہ میں کچھ عجیب سی محسوس کرتی ہوں۔ مجھے یوں لگتا ہے جیسے سب لوگ مجھ سے نفرت کرتے ہیں، سب مجھے ذلیل فلرٹ سمجھتے ہیں۔ میں کیسے بتاؤں کہ میں فلرٹ نہیں ہوں مجھے یاد ہے کہ ایک دن راشد نے کہا تھا "صنوبر آج کے بعد تم ایک منجھی ہوئی فلرٹ ثابت ہوگی" میرے اللہ! کیوں بھلا؟ جب میں نے کبھی فلرٹ بننے کی کوشش ہی نہیں کی تو لوگ مجھے فلرٹ کیوں سمجھنے لگیں گے۔ وہ شیطان خود بھوت بن کر میرے پیچھے پیچھے پھرتا رہتا۔ اس کی سب سے بڑی خباثت یہ تھی کہ وہ دوسروں کے سامنے ایسا کرتا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ جو لوگ میرے ہم رتبہ نہیں ہیں، میں اُن پر حکم جتاتی ہوں۔ لیکن مجھے یہ احساس ستانے لگا کہ میں محض ایک لڑکی ہوں ایک بدصورت لڑکی جو ایک ایسے خاندان سے تعلق رکھتی ہے جو انتہائی قدامت پسندی کے ساتھ آزادروی کو بھی ضروری سمجھتا ہے۔ وہ جانتا تھا کہ میں دلیر اور ذہین ہونے کے باوجود انتہائی شرمیلی بھی ہوں۔ میں نے ایک دفعہ کہا تھا "میں عورتوں کو پسند نہیں کرتی وہ بڑی باتونی ہوتی ہیں" اور اس نے میری تائید کی تھی۔ میں جب سوچتی ہوں کہ میں نے ایسا کیوں کہا تھا تو مجھے معلوم ہوتا ہے کہ اس کا سبب وہ بناوٹ، تنگ نظری اور کمینگی ہے جو عام طور سے عورتوں میں پائی جاتی ہے۔ وہ ایسی معمولی باتوں کے مطالبے کرتی رہتی ہیں کہ جن کو پورا کرنا کسی کے بس کی بات نہیں ہوتی۔ مزید براں وہ احمق اور بے رحم ہوتی ہیں۔ میں نہیں جانتی کہ اس نفرت کا اظہار کیسے کروں جو مجھے عورتوں سے ہے۔ عورتوں کی جن عادات سے مجھے نفرت ہے، وہ سب مائیہ اور پکھراج میں پائی جاتی ہیں۔ میں جانتی ہوں کہ بعض مردوں میں بھی یہ عادات پائی جاتی ہیں لیکن اس قسم کے مرد در اصل زنخے ہوتے ہیں۔ میرے نزدیک علو نظر، سنجیدگی، محبت اور ہمدردی انسانی مثالی خوبیاں ہیں۔

مجھے وہ رات یاد ہے جب میری ماموں زاد ساجدہ آئی اور کہا "صنوبر! اٹھو" میں اٹھ کھڑی ہوئی۔ اس نے میرا ہاتھ پکڑا اور صحن میں لے آئی۔ اس وقت غالباً رات کے ایک بجے کا عمل ہوگا۔ صحن میں جا کر مجھے محسوس ہوا جیسے ایک بڑا سا ہاتھ میرے سر کو سہلا رہا ہے۔ کیا دیکھتی ہوں کہ راشد پاس کھڑا ہے۔ وہ کہنے لگا "مجھے معلوم ہوا کہ تم یہاں ہو۔ تم سے ملنے کے لئے اتنی دور سے آیا ہوں" اس لمحے جب اس نے یہ بات کہی چاروں طرف سے ہجوم کرکے آتی ہوئی تند و تیز ہواؤں کا ایک طوفان تھا جو میرے سراپا پر چھا گیا۔ میں غریب گھبرا گئی۔ میری دوسری ماموں زاد بہنیں مجھ سے نفرت کرنے لگیں اور طرح طرح سے جتانے لگیں کہ دیکھنا اپنی حدود میں رہنا۔ انھوں نے بڑی سنگدلی سے میرے بدنی نقائص کا ذکر کیا اور کہنے لگیں "راشد تو شروع سے ہی ہر ایک کی ہاں میں ملانے کے عادی ہیں" اس سے میری پریشانی میں اور اضافہ ہوا۔ بات یہ ہے کہ اگر راشد کو مجھ سے محبت تھی جیسا کہ وہ دعویٰ کرتا پھرتا تھا تو اس نے اس کا واشگاف اظہار کیوں نہ کیا اور تردد و تذبذب میں کیوں پڑ گیا۔ اس نے حوصلہ مندی سے یہ کیوں نہ کہا "میں اس سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔ میں جانتا ہوں تم لوگ اسے ناپسند کرتے ہو۔ اسے کوئی بھی پسند نہ کرے۔ اس سے شادی کرنے میں مجھے نقصان بھی ہوگا۔ جب تم کہو گی میں اس سے شادی کروں گا۔ لیکن میں اس سے محبت کرتا ہوں۔ میں ساری عمر تمہارے سامنے سر تسلیم خم کئے رہا ہوں۔ میں نے ہمیشہ تمہیں خوش کرنے کی کوشش کی ہے۔ اب میں اپنے آپ کو خوش کروں گا۔" سب کہنے لگیں "صنوبر بڑی بدصورت اور پھوہڑ ہے" ان کا یہ خیال صحیح تھا۔ امی جان نے مجھے لاڈ سے پالا تھا مجھے گھر کے کام کاج کا سلیقہ نہ آسکا۔

اس معاملے کا بدترین پہلو یہ تھا کہ ہر کوئی کہنے لگی "صنوبر خود راشد سے شادی کرنے کی خواہشمند ہے"۔ یہ غلط تھا۔ میں نے نہیں کہا تھا کہ یہ بات نہیں ہے لیکن میری سنتا کون تھا۔ میرے منہ سے نکلے ہوئے ادھورے فقروں اور بے ڈھنگے الفاظ کو انھوں نے دوسرے ہی معنی پہنانے

اور راشد سے کہا "دیکھو یہ کیسی عجیب الفطرت ہے۔" میں شرم کے مارے جھینپ گئی تھی، اپنی صفائی میں کچھ بھی نہ کہہ سکی۔ میں اس قسم کے حالات کو ہمیشہ ناپسند کرتی رہی ہوں کیونکہ میں جانتی ہوں کہ مدافعت نہیں کر سکوں گی۔ مجھے ایک محافظ کی ضرورت تھی لیکن مجھے گومگو کے عالم میں چھوڑ دیا گیا۔ میں اس سے محبت نہیں کرتی تھی لیکن میں نہیں جانتی تھی کہ وہ اس قدر بزدل ثابت ہوگا۔ اس کے عشق و محبت کا سارا جوش و خروش سرد پڑ گیا۔ یہ میرے لئے ناقابلِ برداشت تھا۔ میں ایسے شخص سے نفرت کئے بغیر نہ رہ سکی۔ جو اعلانیہ مجھ سے اظہارِ محبت کرتا رہا اور چند عشقیہ خطوط لکھنے کے بعد دم دبا کر بھاگ گیا۔
اس وقت مجھے یوں لگا کہ کچھ بھی ہو میری شادی اس سے ضرور ہونی چاہیئے ورنہ مجھے زندہ رہنے کا کوئی حق نہ ہوگا۔ وہ میری مشکلات سے واقف تھا وہ سب کچھ جانتا تھا اور تحقیر کے انداز سے مسکرایا کرتا۔ دن رات وہ ایسے مواقع کی تلاش میں رہتا جب وہ آواز بلند یا سرگوشیوں میں مجھے کہا کرتا "صنوبر! خدا کے لئے ایک بار یہ کہو کہ تمہیں مجھ سے محبت ہے۔ میرا دل دھڑکتے دھڑکتے رک جائے گا اور میں جان سے ہاتھ دھو بیٹھوں گا۔ میں جانتا ہوں میری شہرت اچھی نہیں ہے۔ آؤ میں اور تم جنوبی امریکہ بھاگ جائیں۔ میں تمہارے لئے شکار کروں گا۔ تمہارے لئے کھانا پکاؤں گا۔ جب میں مر جاؤں گا تو مجھے دفن کر کے گھر چلی آنا۔ تم کہتی ہو کہ اخلاق؟ اخلاق! ہنستا تھا۔ اخلاق ہے کیا چیز؟ اچھا میں اس لڑکی سے شادی کروں گا جس کا انتخاب میرے گھر والے کریں گے لیکن تم سے بھی بالضرور شادی کروں گا۔ میں تمہیں چھوڑ نہیں سکتا۔"

میں جو اس باختہ تھی اور میرے منہ سے بات تک نہ نکل سکی۔ میں اپنی ماموں زاد بہنوں کی نفرت آلود نگاہوں کو دیکھ دیکھ کر سوچا کرتی اور ورد پڑھتے ہوئے سب کے ساتھ سوچا کرتی کہ اس تمام ہرزہ سرائی کے بعد بھی راشد نے مجھ سے شادی نہ کی تو میں تباہ ہو جاؤں گی۔ لیکن میں کچھ بھی نہ کہہ سکی۔ میں مغرور تھی اور کسی شخص کا ممنونِ احسان ہونا ناپسند کرتی تھی۔

راشد ہوس پرست، جذباتی اور جوشیلا تھا وہ خندہ روں کے لہجے میں ایسی سرگوشیاں کرتا رہتا جن کو دوسرے بھی سن سکیں۔ کمرے کے دوسرے کونے میں بیٹھ کر وہ کہہ دیتا "کمر کتنی باریک ہے۔ اس نے تمہارے اندر بلا کی کشش پیدا کر دی ہے۔ پوری جوان ہو جاؤ گی تو چاہنے والوں کے جھرمٹ میں گھر جاؤ گی۔" میں ان باتوں سے پناہ لینے کے لئے امی کے پاس چلی جاتی لیکن وہ کاغذ کے پرزوں پر کچھ لکھ کر میرے سامنے رکھ دیا کرتا۔ وہ جانتا تھا کہ میں انہیں پھینک نہیں سکتی۔ میں اپنی ممانی اور ماموں سے ڈرتی تھی۔ وہ کہتا "صنوبر! تم میری طرف کیوں نہیں دیکھتیں؟ تم تو مجھے اپنا ہاتھ بھی چھونے نہیں دیتیں۔ تم تو بالکل نازنینہ جیسی نازک ہو۔ بے کس سی لڑکی ہو۔ تم کبوتری ہو لیکن بلی کے پنجے بھی رکھتی ہو۔" پھر چلانے لگتا "میں سماج کا سر پھوڑ دوں گا۔ یہ سماج ہے سماج؟"

میں کہتی "خدا کے لئے میرا پیچھا چھوڑ دو۔ تم جانتے ہو میری تمہاری شادی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ میں خود بھی تم سے شادی کرنا نہیں چاہتی۔ براہِ کرم اپنے رشتہ داروں کے دلوں سے یہ شبہات دور کردو۔"

وہ کہتا "تم چپ رہو۔ ان معاملات میں لڑکیاں دخل نہیں دے سکتیں۔ تمہیں بولنے کا کوئی حق نہیں ہے۔"

اور میرا دل جو حقیقتاً حساس اور شرمیلا تھا ڈوب کر رہ جاتا۔

وہ چند دن میرے لئے درد و الم کی صدیاں بن گئے۔ اس نے ایک دن امی جان سے بڑی گستاخی سے کہا "میں صنوبر سے آپ کی رضا سے شادی کروں گا۔" وہ خوش تھیں کہ عمر کا ساتھ ہو گیا ہے۔ وہ چند دن ہمارے ہی پاس رہا اور میرے عزیزوں سے کہتا پھرا "میں تو صنوبر سے شادی کر رہا ہوں۔ لیکن یہ بات صیغۂ راز میں رہے۔ میرے عزیز اس رشتے کے مخالف ہیں۔" ایک دن اس نے مجھے ہوٹل میں چائے کے لئے بھی کہا۔ میں نے جواب دیا "ایسا ہرگز نہیں ہونے کا۔ میرے ابا مجھ پر بھروسہ کرتے ہیں جب کبھی میں کالج سے دیر سے آتی ہوں اور امی جان مجھے سخت سست کہتی ہیں تو ابا جان کہتے ہیں

"اُسے مت کچھ کہنا۔ اس کی رگوں میں میرا خون ہے۔ یہ کوئی ایسا کام نہیں کرے گی جس سے اس کے خاندان کی رسوائی ہو" میں نے واشد سے کہا "میں جذباتی نہیں ہوں۔ میں ایک تم ایکٹرس کی طرح کبھی بھی تم سے محبت نہیں کروں گی۔ تم مجھ سے شادی کرنا چاہتے ہو تو متعلقہ لوگوں کو رضامند کرو۔ ایسا نہیں کر سکتے تو باغیانہ و ناشگفتہ طریقے سے تمام دنیا کے سامنے اعلان کر دو۔" لیکن اس میں جرأت کہاں تھی۔ وہ مایوس ہو کر بھنا کر چلا گیا۔ اب اس نے مجھے ستانے کا نیا طریقہ اختراع کیا۔ وہ اپنی تجاویز کا ذکر خطوط میں کرنے لگا۔ وہ مجھے لکھتا "تم بدصورت ہو، میں حسین ہوں۔ تم بے مایہ ہو، میں متمول ہوں۔ تم ایک معمولی سی لڑکی ہو، میں ایک افسر ہوں۔ تم نے میری بات نہ مانی تو میں تمہارا ناطقہ بند کر دوں گا۔ میں نے ہمیشہ تمہارے رشتوں میں رخنہ اندازی کی ہے۔ اور میں دیکھوں گا کہ کون تم سے شادی کر سکتا ہے۔ جو کچھ بھی ہو تم میری ہو کر رہو گی۔"

اُس کی آواز سریلی تھی اور وہ عامیانہ پنجابی گیت گایا کرتا اور کہتا یہ تمہارے لئے ہیں۔ بعد میں یہ گانے لگا ؏

محبت ترک کی میں نے گریباں سی لیا میں نے

مجھے یاد ہے کہ کبھی کبھی یہ گایا کرتا تھا ؎

شامِ غم کی قسم آج غمگیں ہیں ہم   آ بھی جا آ بھی جا آج میرے صنم

اور کبھی ؏

ڈھونڈ لایا ہوں گیت میں تیرے لئے

کبھی کہتا "کیا تم نے کبھی گھوڑے کی سواری بھی کی ہے؟ میں چاہتا ہوں کہ تم سواری کرو۔" اور پھر "وہ کونسا دن تھا جب میں تجھ پر عاشق ہوا تھا۔ پتہ نہیں اتنی پیاری کیوں لگتی ہو۔ میں ہر رات تمہیں یاد کرتا ہوں۔ جب تک تمہیں یاد نہ کروں مجھے نیند نہیں آتی۔ میں جانتا ہوں کہ میں تم سے شادی نہیں کر سکتا لیکن تم ایسی پیاری ہو کہ میں تمہیں چھوڑ بھی نہیں سکتا۔ میں کوشش کروں گا کہ تمہارے پاس نہ آؤں لیکن تم نے مجھے بے اختیار کر دیا ہے ...... جہنم میں جائے تمہاری نیک نامی۔ میں اپنے آپ کو خوش کروں گا۔ تمہیں میری خواہش کا کوئی احترام نہیں ہے۔ مجھے تمہاری نیک نامی کی کیا پرواہ ہے میں ساری دنیا کے سامنے تمہیں غلط ثابت کر کے دم لوں گا۔ تم سے کوئی بھی شادی نہیں کرے گا۔ تم پہلے ہی بدصورت ہو۔ میرا نام تمہارے چہرے کا ایک اور بدنما داغ بن جائے گا۔ تمہیں کوئی بھی سہارا نہیں دے گا۔ میں تمہیں عبرت ناک سزا دوں گا۔ کیوں؟ تم مجھے اچھی جو لگتی ہو۔ اتنی پیاری جو لگتی ہو۔"

میں سوچا کرتی کہ کہیں ڈوب مروں۔ اس نے امی جان سے کہا کہ مجھے ہوسٹل میں داخل کرا دیا جائے۔ میں نے صاف انکار کر دیا۔ میں ڈرتی تھی کہ وہ شہر بھر میں میرا پیچھا کرتا پھرے گا۔ کالج ہمارے گھر سے خاصا دور تھا۔ وہ مجھے ڈرایا کرتا "تو مجھ سے ڈر۔ کسی دن تجھے اٹھا لے جاؤں گا۔"

میں کہتی "شرم کرو۔"

وہ جواب دیتا "ماں تو پیچھے دکھائی ہے۔"

میں نے پیچ و تاب کھا کر کہا "جہنم میں جاؤ۔ زبان بند کرو۔ اب کبھی میرے سامنے مت آنا۔"

لیکن وہ جانتا تھا کہ میرے غصے کے پیچھے آنسو چھلکنے لگتے ہیں۔ وہ مسکرا کر زیرِ لب کہنے لگا "صنوبر! صنوبر! صنوبر!"

مجھے یاد ہے کہ وہ بلند آواز میں میرا نام پکارا کرتا اور عام طور سے مجھے "بھی صنوبر" کہہ کر مخاطب کیا کرتا۔ ہم کبھی کبھار شام کو سیر کے لئے جایا کرتے تھے۔ میری ماموں زاد بہنیں بھی ساتھ ہوتیں۔ وہ ہمارے پیچھے پیچھے چلتا اور بلکہ پورے زور سے چلا کر میرا نام پکارتا۔ ساجدہ نے اُسے خاموش رہنے کی تاکید کی لیکن وہ باز نہ آیا۔ میں بوکھلا جاتی۔ میرا جی چاہتا کہ یہاں سے بھاگ نکلوں۔ مجھے ان باتوں سے سخت کوفت ہوتی تھی۔

دو دن گزرے مجھے احساس ہوا تھا کہ بہار آ رہی ہے۔ اس وقت مجھے ایک عجیب و غریب سا خیال آ رہا ہے۔ میں حیران ہوں کہ اسے تخیل کا

گوشہ مجنوں یا دامنِ مجنوں قرار دوں۔ میرا جی چاہتا ہے کہ میں ایک سیاہ دوپٹہ جس پر ستارے ٹکے ہوں، اوڑھ کر صحن میں چارپائی پر جا لیٹوں۔ آنکھیں بند کر لوں اور شیریں نیند میں اپنے تمام دکھ درد غرق کر دوں اور ایک بار پھر ننھی منی بچی بن جاؤں۔

بعض باتیں ایسی بھی ہیں جنھیں میں قلمبند کرنا چاہتی ہوں، لیکن اپنے میں یہ ہمت نہیں پاتی۔

گلرخ آج بڑی بے مروتی اور سرد مہری سے پیش آئی۔ وہ کیوں مجھ سے ہمدردی کا اظہار نہیں کرتی۔ آخر میرا قصور کیا ہے؟ میں اٹھارہ برس کی تھی جب ان الجھنوں میں پھنس گئی۔ بالکل ناکردہ کار، مکھن کی گڑیا کی طرح جسے کسی بات کا علم نہ ہو اور جو معمولی سی بات پر پگھل جائے۔ مکھن سے مجھے راشد کی ایک بات یاد آگئی۔ وہ کہتا تھا میرا جی چاہتا ہے کہ میں تمھیں نگل جاؤں۔ وہ اپنا منہ کھولتا اور مجھے کہتا "آؤ میرے جبڑوں میں آجاؤ۔ میری زبان پر بیٹھ جاؤ میں تم پر دانت نہیں چلاؤں گا۔"

(۸)

کل میں تمثیل دیکھنے گئی تھی۔ بیچ اور گلرخ کے تبصرے میرے لئے خیال انگیز تھے۔ ایک فقرہ اب تک میرے ذہن میں مچل رہا ہے "وہ اُسے تباہ کر گیا ہے۔" یہ درست ہے لیکن ایسا نہیں جیسا کہ وہ سمجھتی ہیں۔ جب کبھی اُسے موقع ملتا راشد مجھ سے باتیں کیا کرتا۔ وہ اپنی جگہ سے اٹھ کر میرے قریب سے گزرتا اور سرگوشی میں ایسی بات کہتا جس سے مارے شرم کے میرا چہرہ تمتمانے لگتا۔ وہ کہتا "تو ایسے ہی منہ بگاڑتی ہے۔ یہ کوئی بُری بات تو ہے نہیں۔" میں اکثر اوقات اپنے آپ کو عجیب سا پاتی ہوں۔ میرا شرمیلا پن لاعلاج ہے۔ یہ بات میرے بس کی نہیں ہے۔ میں مردوں اور عورتوں سے دوسرے معاملات پر تو آزادانہ گفتگو کر سکتی ہوں لیکن عشق و محبت کی بات نہیں کر سکتی۔ یہ عشق وشق پتہ نہیں مجھے کیوں گھٹیا سا لگتا ہے اور اس قسم کی باتیں رذیل تھرڈ کلاس لوگوں والی لگتی ہیں۔ جب کبھی وہ مجھ سے اس قسم کی باتیں کرتا تو میں کلبیت آمیز تمسخر کی کیفیت محسوس کرتی۔ شاید میں اُس کی باتوں کو سنجیدگی سے نہیں سنتی تھی۔ وہ میرے تمسخر سے جھنجھلا جاتا اور کہتا "تم میری بات نہیں مانتیں۔ میں تمہارے دل میں سوراخ کر دوں گا اور تم پچھتاؤ گی۔"

وہ اکثر اوقات مجھ سے پوچھتا "تمہارا رویہ نامحرموں جیسا کیوں ہے؟" اُسے معلوم تھا میں جانتی تھی کہ میں اُس پر بھروسا نہیں کرتی۔ وہ کاغذ پر بیسیوں منصوبے بنا کر میرے پاس بھیجا کرتا تھا لیکن میں جانتی تھی یہ سب بیہودہ باتیں ہیں۔ مجھے اس پر اعتماد نہیں تھا۔ بات یہ ہے کہ وہ سخت مادہ پرست اور عملی قسم کا عقل پرست تھا۔ اس کے کنبے کے سب افراد ایسے ہی تھے۔ میرا خاندان مختلف ہے۔ فرق صرف قدروں کا ہے جنھیں ہم لوگ عزیز رکھتے ہیں۔ میرے خاندان کے افراد زیادہ انسانیت پسند، زیادہ محبت کرنے والے، بامروت اور مذہبی قسم کے لوگ ہیں۔ میں بچپن سے ہی اپنے گھر کے لئے ایک عقدہ بن گئی تھی۔ میں شروع سے بڑی نازک اور خواب پرست تھی۔ میری بہن صبیحہ کی خواب پسندی کو ہمارے ابا جان کے قوی و عملی ذہن نے متوازن بنا دیا ہے۔ میری امی کے خاندان کے لوگ شاعر طبع، تخیل پرست اور فلسفہ دوست ہیں۔ ادبیت اور مذہبیت مجھے باپ دادا سے ورثے میں ملی ہے۔ میں خواب پرست تھی لیکن تلخ حقائق نے مجھے ایسا جھٹکا دیا کہ میری آنکھیں کھل گئیں۔ میرے ماں باپ ہمیشہ ایک دوسرے سے لڑتے جھگڑتے رہے ہیں۔ ان میں طبائع کے اختلاف کے باعث کبھی بھی موافقت نہیں ہو سکی۔ دونوں سخت ضدی ہیں اور اپنی اپنی بات منوانے پر اصرار کرتے ہیں۔ اس چیز نے میرے اندر کلبیت پیدا کی ہے۔

میں اڑھائی برس کی تھی کہ امی بیمار پڑ گئیں اور نانی جان نے ہم دونوں کو ابا جان کے پاس بھیج دیا۔ ان میں ڈیڑھ برس تک ناراضگی رہی اور نانی جان نے ہماری خبر تک نہ لی۔ وہ تو آنا چاہتی تھیں لیکن نانی جان مانع ہوتیں۔ ہمیں ہماری سوتیلی امی نے پالا۔ وہ ہم سے بہت پیار کرتی تھیں اور ہم بھی ماں کی ممتا سے محروم ہونے کے باعث اُن سے مانوس ہو گئیں۔ آخر امی جان گھر والوں کی مرضی کے خلاف ہمارے پاس آگئیں۔ انھیں یہ خیال

سنا یہ تھا کہ میری پھوپیاں گلیوں میں آوارہ گھومتی پھریں گی۔ وہ ہمارے لیے اور بھی بہت قیمتی تھیں لیکن ہمارے اور ان کے درمیان ماں بیٹی کا کوئی رابطہ قائم نہ ہو سکا ہم اُن سے جدا کی جا چکی تھیں تو شاید یہ رابطہ قائم ہو جاتا۔ میں نے انھیں پہچان لیا لیکن مجھے نہ پہچان سکی۔ امی جان نے نوکری کر لی اور مجھے اپنے ساتھ لے جانا چاہا لیکن ہماری سوتیلی ماں اس پر رضامند نہ ہوئیں۔ ابا جان نے انھیں مجبور کیا اور انھوں نے بادلِ ناخواستہ مجھے رخصت کیا۔ عجیب بات ہے کہ ہماری سوتیلی امی ہماری امی جان سے سخت نفرت کرتی تھیں لیکن ہم سے پیار کرتیں۔ اب میں محسوس کرتی ہوں کہ یہ محبت روز بروز کم ہو رہی ہے۔ ہمارے ابا جان سیمابی طبیعت کے مالک تنومند آدمی ہیں۔ وہ ہمیشہ گوناگوں مشاغل میں مصروف رہتے ہیں اور کوئی کام نہ ہو تو بیمار پڑ جاتے ہیں۔ آوارگی یا ذوق میں کسی نہ کسی لڑکی سے محبت کرتے رہتے ہیں۔ ہمارے ماموں ایک عالیشان بنگلے میں رہتے تھے لیکن ہماری امی کی مطلق پروا نہیں کرتے تھے۔

میرے بڑے ماموں شروع سے متکبر اور خود غرض ہیں۔ وہ دوسروں پر ظلم کرتے ہیں لیکن بیوی کے دست بستہ غلام ہیں۔ یہ عنصرِ حیات ایک حد تک مجھ میں بھی موجود ہے۔ میں محسوس کرتی ہوں کہ میں بھی ایسے مغرور اور سنگ دل شخص سے رابطہ و تعلق نہیں رکھ سکوں گی جس کی اپنی کوئی رائے ہی نہیں تھی۔ میرے خیال میں وہ میری طرف اس لیے مائل تھا کہ نئی نسل کے افراد میں مجھے سب سے زیادہ عقیدت اور احترام کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا مجھے ادبیات اور فلسفے میں دلچسپی تھی اور سیاسیاتِ عالم میں درک رکھتی تھی میں خوابوں کی دنیا میں بستی تھی اور صبح سویرے جاگتے ہی گنگنایا کرتی تھی ؎

اُٹھیے کہ اب تو لذتِ خوابِ سحر گئی

میری گفتگو طنزیہ نہیں تھی اس لیے لوگ میری باتیں سننا پسند کرتے تھے میں اپنے آپ میں اس قدر گم رہتی۔ وہ میرے بشرے پر ایسی افسردگی چھائی رہتی کہ خاندان کا ہر فرد مجھے خوش رکھنے کی کوشش کرتا تھا۔ راشد شروع سے میرے طور طریقوں اور میری پسند ناپسند کی نقالی کرنے لگا تھا وہ میرے سامنے شعر پڑھتا اور ایسی کتابوں سے کہانیاں سناتا جو میں نے نہیں پڑھی تھیں۔ وہ میری قدر بھی کرتا تھا اور میرے نقشِ قدم پر چلنے کی کوشش میں لگا رہتا تھا لیکن اس میں ناکام ہو کر وہ مجھ سے نفرت کا اظہار بھی کرتا تھا۔ وہ میری دل شکنی میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھتا۔ جب وہ ہائی اور میں آنرز کے مرحلے پر تھا میں پاسٹرناک کا ڈاکٹر ژواگو پڑھ رہی تھی۔

میرے ہم عمر مجھ سے سخت مرعوب تھے وہ مجھے اپنی پروفیسر سمجھ کر محبت کرتے تھے۔ راشد کا رویہ ابتدا میں میرے ساتھ معاندانہ تھا لیکن میری جرح و تنقید نے اس کا سارا غرور خاک میں ملا دیا۔ اس سے وہ میری قدر بھی کرنے لگا اور مسابقت پر بھی کمربستہ ہو گیا۔ وہ کہتا تھا کہ اس قدردانی نے بعد میں محبت کی صورت اختیار کر لی تھی۔ اس کے دوست میری ذہانت کی مبالغہ آمیز تعریفیں کیا کرتے تھے مجھے اس کے اوصافِ محبت پر بھروسا نہیں تھا۔ میں نے اس سے کہا: "تم میری ذات سے، ایک بے چاری بدصورت لڑکی سے محبت نہیں کرتے بلکہ میری ذہانت اور شہرت پر فریفتہ ہو۔"

جب میں بچی تھی تو میرے ماموں اور ممانی مجھ سے بڑا پیار کرتے تھے۔ راشد کی امی جو ایک اوباش، بدقوارہ عورت تھی، کسی کے ساتھ بھاگ گئی۔ اس سے سارے خاندان کی ناک کٹ گئی۔ راشد اور اس کا باپ کسی رشتے دار کو منہ دکھانے کے قابل نہ رہے۔

راشد دیوانوں کی طرح مجھ سے باتیں کرتا تھا اور کہا کرتا تھا میں تم کو اپنی بنا کر چھوڑوں گا۔ میں ایک سرکش لڑکی تھی اور یہ بات سب کو معلوم تھی۔ میری نقالی میں راشد نے بھی گھر والوں کے خلاف بغاوت کا علم بلند کر دیا لیکن اس میں اپنی بہنوں کے مقابلے کی سکت نہیں تھی۔ یہ بات میں نے اس سے کہی تو کہنے لگا "[illegible]"۔ ابتدائی خطوں میں وہ مجھے ساراقی کہتا رہا اور اس بری طرح پیچھے جا کر میرے پیچھے پڑا کہ میں حیران تھی کہ کس طرح اس سے جان بچاؤں۔ اب مجھے سکون میسر آگیا ہے لیکن حقیقت یہی ہے کہ اس زمانے میں اس نے باتیں کر کر کے مجھے اپنے پاؤں سے

انکار دیا تھا۔ یہ احساس ابھی تک میرے ذہن و قلب پر حاوی ہے۔ میں نے کبھی بھی اس سے محبت نہیں کی لیکن میرے دل میں ایسی تلخی پیدا ہو گئی ہے کہ ہر کہیں اور ہر وقت مجھے تکلیف دیتی رہتی ہے۔ گرتا نے مجھے ہندی کا ایک دوہا سنایا تھا جو مجھے کبھی نہیں بھولتا اور میرے اعصاب پر سوار ہو گیا ہے۔ میں گرتا کو چاہتی ہوں اس لئے نہیں کہ اس میں بھی راشد کی خوبیاں ہیں بلکہ اس لئے کہ اس کی اپنی ذات میں بھی خوبیاں ہیں۔ وہ ذہین ہے اور راشد کی طرح دوسرے لوگوں سے آزادانہ مل جل سکتی ہے۔ مجھ سے محبت بھی کرتی ہے اگرچہ بعض اوقات اس کی طنز مجھے چڑا دیتی ہے۔ وہ ذہن رسا کی مالک ہے۔ بعض اوقات میں محسوس کرتی ہوں کہ وہ سب سے زیادہ مجھ سے قریب ہے اور اب میں دنیا میں تنہا نہیں ہوں لیکن مجھے اس کے تحائف قبول نہیں کرنے چاہئیں۔ یہ سراسر حماقت ہے۔ مشکل یہ ہے کہ میں انکار نہیں کر سکتی۔

میں اکثر سوچا کرتی ہوں کہ مجھے گنہگار ہونے کا احساس کیوں ہے۔ ایک دفعہ ضمیر کے متعلق سوچتے ہوئے میرے دل میں یہ سوال پیدا ہوا کہ جب ہم کوئی فعل قبیح کرتے ہیں تو قدرتاً ہمیں پشیمانی کا احساس ہوتا ہے لیکن جب کوئی دوسرا ہمارے ساتھ ناحق زیادتی کرتا ہے تو ہم کیوں پشیمان ہوتے ہیں۔ مجھے اس کا کوئی جواب نہیں سوجھا۔ میں نہیں سمجھ سکی کہ یہ سب کچھ کیوں ہوا۔ بظاہر اس کی وجہ یہی ہے کہ مجھ سے ایک شخص نے کہا تھا میں تم سے دیوانہ وار محبت کرتا ہوں۔ اس کے رشتہ داروں نے اسے منع کیا تو وہ ان کے سامنے جھک گیا اور کہیں اور شادی رچالی۔ میں نے اس کے دعووں سے کبھی دلچسپی نہیں لی تھی بلکہ اس سے دور بھاگتی رہی لیکن اس کے باوجود اس کے رشتہ داروں نے ایسے توہین آمیز کلمے کہے کہ میں قیامت تک ان کی شکل دیکھنا گوارا نہیں کروں گی۔ وہ جانتی تھیں کہ میں بے قصور تھی لیکن راشد ان کا داماد تھا اور میں ایک بے مایہ حقیر سی لڑکی تھی۔ اس قدر حقیر کہ وہ مجھے اپنی انگلیوں میں کچل سکتی تھیں۔ راشد نے اس کا مطلب یہ لیا کہ میں اسے ناپسند کرتی ہوں اور کسی اور سے شادی کی متمنی ہوں۔ میرے ذہن میں کوئی ایسا شخص نہیں تھا۔ میں نے کبھی سنجیدگی سے اس بارے میں سوچا ہی نہیں تھا۔ میں نہیں سمجھ سکی کہ میرا کیا قصور تھا اور مجھے کیوں اس قدر کڑی سزا دی گئی۔

(۹)

میں مطالعہ کی کوشش میں تھی کہ یکلخت مجھے خیال آیا کہ وہ دہشت جو راشد کے خیال سے وابستہ تھی اب بہت کچھ کم ہو گئی ہے۔ اس کے لئے میں اپنی سہیلی کی ممنون ہوں۔ میں اسے سہیلی نہیں کہہ سکتی کیونکہ میں نے دیکھا ہے کہ اس پر خلوص رکھتی ہے۔ حقیقی دوستی تو دو طرفہ ہوتی ہے۔ میں نے اسے سب کچھ بتا دیا۔ یہ احساس کہ دنیا میں صرف میں ہی جانتی ہوں جو کچھ مجھے پیش آیا تھا ایک بھولے بسرے خواب کی دھندلی یاد میں بدل گیا ہے۔ یہ الفاظ میں اسی قلم سے لکھ رہی ہوں جو راشد ہمارے ہاں بھول گیا تھا۔ مجھے اس سے قبل کبھی اس قلم کو چھونے کی جرأت نہیں پڑتی تھی۔ میں صمیم قلب سے دعا کرتی ہوں کہ خدا میری سہیلی کو تمام عمر دلشاد اور بامراد رکھے۔

مصیبت یہ ہے کہ میں انسانوں کو تولنے اور ناپنے کے حق میں نہیں ہوں۔ انسان شروع سے آخر تک انسان ہی رہتا ہے۔ مختلف انسانوں میں جو چیز مابہ الامتیاز ہے یا ایک کو دوسرے پر فوقیت دینے کا سبب ہو سکتی ہے وہ حسن اخلاق و کردار ہے۔ صداقت و دیانت ہے، ہمدردی انسانی ہے، دل سوزی ہے جس کے بغیر آدمی انسان نہیں ہو سکتا۔ ممکن ہے کہ تعلیم و تدریس سے انسان کی اصلاح ہو جائے لیکن اس بات کا امکان بھی ہے کہ تعلیم و تدریس انسان کو بگاڑ بھی دے۔ اگر تعلیم کا مطلب یہ ہے کہ انسان دوسروں کی چھوٹی موٹی فروگزاشتوں پر گرفت کر کے فخر و مباہات محسوس کرے تو مجھے جاہل ہی رہنے دیجئے۔ بات یہ ہے کہ کسی شخص کی قدر محض اس لئے کرنی ضروری نہیں ہے کہ کوئی مرد یا عورت خوبصورت و حسین ہے یا کوئی ایم۔ اے ہے۔ بلکہ اس لئے کہ وہ انسان ہے۔ کوئی شخص جتنا اپنی فطری نیکی کو اجاگر کرنے میں کامیاب ہو گا اسی نسبت سے اس کا احترام بھی واجب ہونا چاہئے۔

ایک دن جب راشد گھنٹہ بھر میرے سامنے بار بار اظہارِ مدعا کرتا رہا اور میں غصے سے لال بھبھوکا ہو گئی اور چیخ کر کہا "کیوں؟" تو اس نے کہا تھا: "اس لئے کہ میں خوبصورت ہوں، ایک خوبصورت نوجوان جو چاہے کر سکتا ہے۔" میں نے اس سے اتفاق نہیں کیا لیکن میں جانتی تھی کہ وہ سچ کہہ رہا ہے۔ دنیا میں بالعموم ایسا ہی ہوتا ہے۔ گلرخ کہتی ہے کہ عقل و خرد کی جلا اور علم و فضل انسان کی خوبی کے لازمی اجزا ہیں اور دوسروں کی نگاہوں میں اس کا مقام بلند کر دیتے ہیں۔ میں اس بات کے جیسیوں جواب دے سکتی تھی لیکن ایک تو یہ کہ میرے جواب ٹھوس نہ تھے اور دوسرے میں اپنی گھبراہٹ کو چھپا نہیں سکتی تھی۔ میں حیران ہوا کرتی ہوں کہ کون سی چیز میرے لئے زیبِ نفس کا باعث ہوتی ہے، میری گھبراہٹ یا میری جرأت؟ ان میں ایک کا زیبِ نفس ہونا یقینی ہے کیونکہ دونوں ایک دوسرے کی ضد ہیں۔ مجھ میں دونوں موجود ہیں۔ یا تو میں کسی نتیجے پر نہیں پہنچ سکتی اور یا میرا ذہن اضداد کا مجموعہ ہے۔

(۱۰)

گلرخ دیر تک رد و قدح کرتی رہی لیکن میں اس کی بات ماننے کے لئے تیار نہیں ہوں۔ یہ البتہ وہ سچ کہتی ہے کہ میرے لئے زندگی کے تلخ حقایق کا سامنا کرنا بہت ضروری ہے۔ میں اس کے لئے تیار ہوں، اور ایسا کرنے کے لئے میرے اندر جرأت بھی ہے لیکن میں اتنا جانتی ہوں کہ ایسا کرنے سے جو تھوڑی بہت خوشی مجھے میسر ہے وہ بھی فنا ہو جائے گی۔ میں صرف اپنے آپ کو بھلا کر ہی خوش رہ سکتی ہوں۔ میری ناخوشی کا اولین سبب اپنی بدصورتی کا احساس ہے۔ اس حقیقت کا سامنا کرنا میرے لئے اور بھی عذاب بن جائے گا۔ وہ کہتی ہے کہ میں فراڈ ہوں لیکن یہ صحیح نہیں۔ میں اپنے آپ کو مخلص اور راستباز پاتی ہوں۔ میری ماموں زاد بہنیں سب خوبصورت، تندرست، توانا اور معتدل مزاج ہیں۔ جب کبھی میرے والدین میری شادی کا ذکر چھیڑتے ہیں تو میرا خون کھول اٹھتا ہے اور جب وہ ایم اے اور ڈبل ایم اے کا قصہ لے بیٹھتے ہیں تو میں آپے سے باہر ہو جاتی ہوں۔ بعض لوگ مجھے نوکری کا مشورہ دیتے ہیں۔ مجھے لیکچرار بننے سے نفرت ہے۔ میری ایک عزیزہ کہنے لگی "کسی نہ کسی دن تم پرنسپل بن جاؤ گی۔" میں صاف صاف کہے دیتی ہوں کہ میں نوکری کو پسند نہیں کرتی۔ یہی بات میں نے نصرت سے کہی تو اس نے ایسی قہرناک نگاہوں سے میری طرف دیکھا گویا میں نے اس سے کوئی چیز چھین لی ہے۔ آخر مجھ سے نوکری کرنے کی توقع کیوں کی جاتی ہے۔ میں کیوں شادی نہ کروں، اور بچے پیدا کر کے کیوں موٹی نہ ہو جاؤں؟ میں نے یہ دلیل محض چڑ کر دی تھی۔ میرے ذہن کا ایک حصہ دوسرے حصے کے خلاف کشمکش کرتا رہتا ہے اور میں کوئی فیصلہ نہیں کر پاتی۔ میں جانتی ہوں کہ زندگی میں کامیاب ہونے کے لئے کسی مقصد کا تعین ضروری ہے اور اس کے حصول کے لئے عزمِ صمیم لازم ہے۔ میری مشکل یہ نہیں ہے کہ میری زندگی کا کوئی نصب العین نہیں ہے۔ مصیبت یہ ہے کہ میرے نصب العین دو ہیں، اور دونوں خاصے قوی اور پرکشش ہیں، اور میرے راستے میں مزاحم ہوتے رہتے ہیں۔ آج کل میں ذہنی بے حسی کی شکار ہو گئی ہوں۔ میں نے اپنے آپ کو حالات کی زد کے سپرد کر دیا ہے لیکن جو کچھ مجھ سے ہو سکتا ہے اپنی بہتری کے لئے کرتی ہی رہتی ہوں۔ کل سے میرے سر میں یہ سودا سما رہا ہے کہ میں اپنی صحت کو درست کروں اس لئے خوب کھانے کی کوشش کرتی ہوں لیکن زیادہ نہیں کھا پاتی۔ آج کے دن کے لئے میرے ارادے بڑے اچھے تھے لیکن مجھے حرارت محسوس ہو رہی ہے۔ گلرخ کہتی ہے میں تمہاری بہتری کے لئے تم سے اس قسم کی باتیں کیا کرتی ہوں لیکن میرے سر میں تپش سی ہے۔ میری بدقسمتی کا ثبوت یہ ہے کہ جب کبھی میں دلی محبت، التفات اور رہنمائی کے لئے خواہش کا اظہار کرتی ہوں تو لوگ اس کا مطلب یہ لیتے ہیں کہ میں ان سے رحم طلب کر رہی ہوں۔ میں بار بار کہہ چکی ہوں کہ میں کسی کی ممنونِ احسان نہیں ہونے کی مجھے کسی کے رحم کی ضرورت نہیں ہے۔ آخر گلرخ کیوں میری بات نہیں سمجھتی۔

(۱۱)

میرا خیال ہے یہ سایہ میری ساری زندگی کو تاریک کر دے گا۔ یہ کوئی معمولی واقعہ نہیں تھا۔ ایک طوفان تھا، جہنم تھا۔ راشد نے اپنی شادی پر

مجھے ایک نہایت خوبصورت دعوت نامہ بھیجا۔ سب لوگ مجھے شک وشبہ کی نظروں سے دیکھنے لگے۔ جب میں نے چیخ کر کہا کہ "اس خاندان سے ہم کوئی راہ ورسم نہیں رکھیں گے۔" تو امی جان حیران تھیں کہ میرا مطلب کیا تھا۔ وہ اصل بات نہیں جانتیں۔ رجیہ جانتی ہے لیکن اُسے میرے ساتھ کوئی ہمدردی نہیں۔ وہ کہتی ہے سارا قصور آپ کا اپنا ہے۔ آپ نے کیوں معاملے کو جاری رہنے دیا۔ کیوں نہ شروع میں ہی اس کا خاتمہ کر دیا۔ مجھ پر گنہگار ہونے کا احساس حاوی ہو گیا ہے۔ مجھے معلوم ہے کہ یہی احساسِ معصیت میرے لئے بلائے بے درماں بن گیا ہے۔ پھر میں سوچتی ہوں اس وقت میں بالکل نوخیز تھی میری عمر صرف سترہ اٹھارہ برس کی ہوگی۔ میرے ماں باپ ہر وقت آپس میں لڑتے جھگڑتے رہتے تھے۔ میں فیصلہ نہ کر پائی کہ ان میں کون حق بجانب ہے مجھے اپنی بدصورتی کا عذاب ناک احساس تھا۔ میں بے حد شرمیلی اور جھینپو مزاج تھی۔ مزید براں اپنی کس مپرسی اور تنہائی کے احساس نے میری قوت سلب کر لی تھی۔ اس لئے میں ناساعد حالات کا سامنا کرنے سے قاصر تھی۔ اپنی طرف سے میں نے بچاؤ کی پوری کوشش کی۔ اُسے بارہا سرزنش کی۔ اُسے صاف صاف بتا دیا میں تم سے محبت نہیں کر سکتی۔ اُس سے دور بھاگتی رہی۔ وہ بڑی چالاکی سے ایسے مواقع کی ٹوہ میں رہتا تھا جب وہ مجھ سے مخاطب ہو سکے لیکن اکثر اوقات میں اُسے بات کا جواب تک نہیں دیتی تھی۔ میں نے اُس سے پیچھا چھڑانے کی ہر ممکن کوشش کی مگر وہ برابر میرا پیچھا کرتا رہا۔ مجھے یوں لگا جیسے میں کسی قندیل کو اپنے دوپٹے سے ڈھانپنے کی کوشش کر رہی ہوں۔ سب بے سود۔ اس کے علاوہ میں کر بھی کیا سکتی تھی۔ کچھ بھی نہیں۔ کچھ بھی نہیں۔

میرے سامنے یہ سوال اُبھر رہا تھا کہ اب میں کیا کروں۔ میں نے محسوس کیا کہ اپنے ذہن سے یہ تاثرات زائل کرنے کے لئے مجھے شادی کر لینی چاہیئے ہمارے عزیزوں میں ایک آدمی تھا جو خاصا آسودہ حال تھا لیکن وہ کچھ زیادہ پڑھا لکھا نہیں تھا اور چالیس کے پیٹے میں تھا۔ میں جانتی تھی کہ وہ مجھ سے شادی کا خواہاں ہے۔ میں نے اس سے کبھی بات بھی نہیں کی لیکن اُس کی ذات سے مجھے بڑی امیدیں وابستہ تھیں۔ ابا جان نے اُسے بُری طرح لعنت ملامت کی۔ اتنی بدسلوکی تو شاید وہ بیٹے کتے سے بھی نہ کرتے۔ یہ لوگ مجھ پر فخر کرتے ہیں اور میرا سر چکرانے لگتا ہے۔ دل ڈوب ڈوب جاتا ہے اور میرے سراپا پر نقاہت طاری ہو جاتی ہے۔ جو کچھ مجھ سے ہو سکتا ہے میں کرتی ہوں۔ مطالعے، کھانا پکانے، اٹھنے کھیلنے، خوش باش رہنے کی کوشش کرتی ہوں لیکن میرے دل کو کچھ ہو گیا ہے۔ میں کیا کروں؟ صنوبر کیا کرے؟

ایک دفعہ میں نے ایک فلم دیکھی تھی جس کی ہیروئن نے کہا تھا "میں نے باپ کا کہا نہ مانا اس لئے میرا یہ حشر ہوا۔" لیکن میں تو بڑی عاقبت اندیش تھی۔ میں راہی تباہی کہتی رہتی لیکن میرا ارادہ دراست اقدام کا نہیں تھا۔ مگر رجیہ کہتی ہے کہ میں سب کچھ بلا کم وکاست قلمبند کروں۔ شاید اس سے مجھے کچھ فائدہ ہو لیکن بہت سی باتیں ایسی ہیں جو میری زبان پر آ سکتی ہیں نوکِ قلم پر نہیں آ سکتیں۔

مجھے خیال ہے کہ وہ اکثر اپنی جیب سے میری عکسی تصویر نکال کر کہتا "میں تمہاری نسبت اسے زیادہ پسند کرتا ہوں۔ میں اسے اپنی جیب میں رکھ سکتا ہوں لیکن تم مجھ سے دور بھاگتی ہو۔ میرے قریب بھی نہیں پھٹکتیں۔ صنوبر! تم جانتی ہو مغرب میں رواج ہے کہ شرفا خواتین سے ملتے ہیں تو اُن کے ہاتھ کو بوسہ لیتے ہیں۔ میں تمہیں یقین دلاتا ہوں کہ اخلاقی پہلو سے اس میں کوئی قباحت نہیں ہے۔ صنوبر! آؤ مجھے اپنا ہاتھ چومنے دو۔ اخاہ! تم تو ہمیشہ بھاگ جاتی ہو۔" یہ کہہ کر وہ میری عکسی تصویر کو چومنے لگتا اور میری موجودگی میں اُس سے خود کلامی کرتا۔ یہ دیکھ کر مجھے سخت کوفت ہوتی اور جی چاہتا کہ بھاگ جاؤں۔ مجھے علم تھا کہ وہ محض ایکٹنگ کر رہا تھا، عامیانہ قسم کی ایکٹنگ۔ میں کہنے لگی "یہ کیا مذاق ہے؟" اس نے جواب دیا "صنوبر یہ مذاق نہیں ہے۔ میں حقیقتاً یہ محسوس کرتا ہوں۔" میں نے کہا "میں یہ ماننے کو تیار نہیں ہوں۔ اس کا سبب محض میری غیر معمولی کم ہمتی ہے۔" وہ بڑا ڈراما باز تھا اور یہ اس کے کردار کا نمایاں وصف تھا۔ اس نے کہا صنوبر! جب میں نے تمہاری علالت کا سنا تو مجھے اس قدر رنج ہوا کہ میں حواس

کھو بیٹھی تھی۔ میرے اندر باغیانہ خیالات سر اُٹھانے لگے۔ میں سوچ رہی تھی کہ کسی انسان کو علمی قابلیت سے جانچنا کیا ضرور ہے۔ اس کے علاوہ تو میرے اندر کوئی بھی خوبی نہیں ہے۔

اُس نے کہا "صنوبرا تم گالیاں دینا سیکھو۔ میں گالیاں پسند کرتا ہوں۔ میں تم کو جاپانی کشتی جو جٹ سو سکھاؤں گا۔ اور تم مجھے ایک لمحے میں چاروں شانے چت گرا دو گی۔ تم پہلے ہی مجھ پر چھا چکی ہو۔ ننھی کمزور لڑکی! میں تجھ سے ڈرتا ہوں۔ ہاں میں! جو اپنی چھنگلی سے تجھے جان سے مار سکتا ہوں۔ صنوبرا خدا کے لئے مجھے گالی دو مجھے اُلّو کا پٹھا کہو"۔ میں نے کہا "خدا کے لئے میرا پیچھا چھوڑ دو۔"

اُسے معلوم ہو گیا کہ اُن دنوں میں عمر خیام کی شیدائی تھی۔ وہ کہتا "صنوبرا مجھے بھی کچھ سناؤ مجھے بھی خرد مندی سے فیض یاب کرو"۔ میں رباعیات پڑھنے لگتی اور وہ پر جوش جذبات سے بھرائی ہوئی آواز میں سرگوشیاں کرنے لگتا "صنوبرا تمہاری آواز میں کیسے بھول سکوں گا۔ یہ شیریں رسیلی آواز صنوبرا صنوبرا!" اُسے ایک رباعی پسند آئی: "شراب کا پیالہ ہو، شعروں کی بیاض ہو، تم میرے سامنے بیٹھی ہوئی گا رہی ہو تو ویرانہ جنت بن جائے گا"۔ میں گھبرا گئی۔ میرا سر چکرانے لگا۔ میں پہروں ایک ہی جگہ بیٹھی رہی۔ میرا جی نہیں چاہتا تھا کہ یہاں سے اُٹھ کھڑی ہوں یا کسی سے بات کروں۔ میں نے اپنے آپ کو اپنی کیفیات کے سپرد کر دیا تھا۔

ایک دفعہ وہ ہمارے یہاں آیا۔ میں ہاتھ میں تولیہ لئے غسل خانے کی طرف جا رہی تھی۔ اچانک اُس نے دروازہ کھولا اور اس کا مسکراتا ہوا چہرہ میرے سامنے آ گیا۔ وہ اس قدر باتونی تھا کہ ہر وقت میرا اور امی جان کا مغز چاٹا کرتا۔ وہ امی جان کو خواہ مخواہ مشورے دیا کرتا۔ صنوبر کو ہوسٹل میں داخل کرا دیجئے۔ میں اس کا خیال رکھوں گا۔ دونوں بہنوں کے رشتے کی بات مجھ پر چھوڑ دیجئے۔ میں سب کچھ ٹھیک کر دوں گا۔ میں کسی زرعی افسر سے کیوں نہ سلسلہ جنبانی کروں؟"

"نہیں نا شدا" میری امی کہتیں "میں آدمی کی ذہنی خوبیوں کو پسند کرتی ہوں اُس کی دولت سے غرض نہیں رکھتی۔ تم جانتے ہو میری بیٹیاں دوسری لڑکیوں سے قدرے مختلف ہیں۔ خاص طور پر صنوبر ہمارا بھی خاصی عقدہ بن گئی ہے۔"

"فکر مت کیجئے۔ میں اسے ہموار کر دوں گا۔ یہ اتنی خاموش کیوں رہتی ہے آخر؟ اسے ایسا جھنجھوڑنے کی ضرورت ہے کہ بس بالکل درست ہو جائے۔" پھر سرگوشی کے لہجے میں مجھ سے کہنے لگا "صنوبر میرا جی چاہتا ہے کہ تمہیں پکڑوں اور خوب جھنجھوڑوں۔ میرے بازو دیکھو۔ ان کے پٹھے دیکھو۔ مجھ سے ڈرا کرو۔ میں تمہیں دیکھتا ہوں تو مجھے تن من کا ہوش نہیں رہتا۔ میں ڈرتا ہوں کسی دن تمہاری جان نہ لے بیٹھوں۔"

جب کبھی میں قریب ہوتی وہ چائے گرا دیتا اور میری طرف گھور گھور کر دیکھتا رہتا۔ وہ کہتا "جب میں تمہیں دیکھتا ہوں تو مجھے چین آ جاتا ہے۔ آتشکدے کے بعض کردار یاد آ جاتے ہیں۔ صنوبرا تم کسی ناول کی زندہ کردار ہو۔ ایا ونڈ ہو! میری ننھی لیلیٰ! میں تمہارے دل میں سوراخ کر دوں گا۔ کاش کہ تم ایک جنگلی ہوتیں اور میں جنگلی ہوتا۔ میری جان! ہم سڑک کے بیچ اپنی اپنی ٹوکریاں سر پر اٹھائے ہاتھ میں ہاتھ دیئے ناچتے گاتے۔" پھر کہا "میں تمہارے عزیزوں کو پسند نہیں کرتا۔"

"میرے عزیزوں کا ذکر مت چھیڑنا۔ میں کب تمہارے لوگوں کو پسند کرتی ہوں۔ میں اپنے رشتے داروں کو چاہتی ہوں۔ تمہیں مجھ سے ایسی باتیں کرنے کا کوئی حق نہیں ہے۔ آخر تم سمجھتے کیا ہو۔ آخر میں تمہاری لگتی کیا ہوں؟"

"تم میری نہیں بننا چاہتیں تو آخر چاہتی کیا ہو۔ بس اتنا کہہ دو میں تمہاری بیوی بنوں گی۔ ایک دفعہ صنوبرا صرف ایک دفعہ۔"

"نہیں! کبھی نہیں! بس اب تم یہاں سے چلے جاؤ" میں نے چلا کر کہا۔

پھر جب وہ آیا تو میں فرش پر چٹائی بچھائے چھت کے برقی پنکھے کے نیچے لیٹی تھی۔ اس کے بھاری قدموں کی چاپ سے میری آنکھ کھل گئی۔ وہ قریب کھڑا ہوا میری طرف دیکھ رہا تھا۔ میں اُٹھ بیٹھی تو وہ کہنے لگا "بالکل نڈھال لگتی ہو۔" میں نے باورچی خانے سے چائے منگوائی۔ وہ تولیہ اُٹھائے غسل خانے کی بجائے باورچی خانے میں آ گیا۔ "تم جانتی ہو گھر والے میرے رشتے کی فکر میں ہیں۔ خدا کرے اس لڑکی کا باپ مجھے رد کر دے۔ میں اس سے بازاروں کی طرح پیش آؤں گا۔ تم میرا رشتہ کیوں نہیں کرا دیتیں۔ صنوبر اب کچھ چھوڑو، بس کسی سے شادی کر لو۔ تمہاری عمر اٹھارہ برس کی ہونے کو آئی اور ابھی تک تم دوسروں کی دست نگر ہو۔ یہ ناقابل برداشت ہے۔ صنوبر! بعض اوقات میں سوچنے لگتا ہوں کہ میں تمہاری اس حالت کو نہیں دیکھ سکتا۔ کیا یہ بہتر نہ ہوگا کہ میں تمہیں مار ہی ڈالوں۔ تم کیوں خواب آور گولیاں نہیں کھا لیتیں۔ کیوں پھانسی نہیں لے لیتیں۔ جیسا کہ تم خود کہا کرتی ہو میری جان! میں جانتا ہوں میں نے تمہاری زندگی تباہ کر دی ہے۔ میں تمہیں کسی دن جان سے مار دوں گا۔ اگلی دفعہ ضرور تمہارے لئے زہر لیتا آؤں گا۔ میں جانتا ہوں کہ تمہیں کبھی بھی نہ بھول سکوں گا۔"

اُس دن صبیحہ نے اُسے بہت کچھ کہا۔ وہ کہنے لگی "آپ کیسے بے حیا ہیں۔ تعلق کے پردے میں آپ میری آپا کی زندگی برباد کر دینا چاہتے ہیں۔ آپ کو علم ہے کہ وہ جواب نہیں دے سکتی کیونکہ آنسوؤں نے اُس کے گلے میں پھندا ڈال دیا ہے۔ آپ جانتے ہیں کہ وہ بدصورت ہے اور اگر آپ کے خلاف کچھ کہے گی تو کوئی بھی اسے تسلیم نہیں کرے گا۔ بس چلے جائیے اور کبھی بھی ادھر کا رُخ نہ کیجیے گا۔ آپ اُس سے شادی کرنے کی جرأت نہیں رکھتے تو اس بے حیائی سے اُس کے پیچھے کیوں پڑتے ہیں۔ میں نے آپ کو دوبارہ یہاں دیکھا تو میں اپنی امی جان کو سب کچھ بتا دوں گی اور نتائج کی ذمے داری آپ پر ہوگی۔"

اُس نے ڈھٹائی سے جواب دیا "تم جو چاہے کہو، مجھے کسی کا ڈر نہیں ہے۔ میں جب چاہوں گا اُس سے ملوں گا۔ میں اُسے یہاں سے لے جاؤں گا اور جہاں چاہوں گا رکھوں گا۔ اب میں یہاں کبھی نہیں آؤں گا اور صنوبر اب تم کو خط بھی نہیں لکھوں گا۔ لیکن میں جنت یا جہنم کے دروازے تک تمہارا پیچھا کروں گا۔ میں اُس وقت تک تمہارا تعاقب کرتا رہوں گا جب تک ہم دونوں میں سے ایک مر نہ جائے۔ میں تم سے دور ہوں گا، میرا دل تمہارے پاس رہے گا۔ میں خواہ شادی کروں، تمہاری شادی نہیں ہونے دوں گا۔ تم ہمیشہ میری ہی رہو گی۔" پھر صبیحہ سے مخاطب ہو کر کہنے لگا "صبیحہ! براہ کرم اس کا خیال رکھنا۔"

اُس نے جو تین خط اس کے بعد مجھے لکھے وہ میں گلرخ کو دکھا چکی ہوں۔ وہ پھر نہ آیا۔ میں حیران ہوں کہ کیا کہوں۔ میرے ذہن میں عجیب غریب خیالات ہجوم کرتے ہیں۔ صبیحہ کہتی ہے کہ اس نے مجھے فلرٹنگ کے لئے اس لئے منتخب کیا تھا کہ میں بدصورت ہوں اور وہ مجھ سے شادی نہ کرنے کے بارے میں حق بجانب ہے۔ یہ خیال اس نے میرے ذہن میں ڈال دیا ہے۔ میں دن رات لرزاں رہتی ہوں، بھیانک خواب دیکھتی ہوں۔ میں نے اُسے کئی بار اپنے خوابوں میں دیکھا ہے۔ جب میری آنکھ کھلتی ہے تو اس کے قرب کی آرزو مجھے ستانے لگتی ہے۔ میں خدا کا شکر کروں گی جب اس واقعہ کو بھلا سکوں گی۔ لیکن میری زندگی کا یہ نہایت اہم واقعہ ہے۔

(۱۲)

میرا خیال تھا اب قلم نہیں اٹھاؤں گی لیکن کسی قوی جذبے نے مجھے لکھنے پر مجبور کر دیا۔

آج نفیسہ ہمارے یہاں آئی۔ وہ کچھ لئے دیئے رہی اور میری تقریر کی تعریف اس نے ایسے خلوص انداز سے کی کہ میں شرمسار ہو گئی۔ کیونکہ میں جانتی تھی کہ میری تقریر میں جابجا اصلاح کی گئی تھی۔ مباحثے کے نقطۂ نظر سے البتہ خاصی تھی۔

میں کئی روز سے یہ محسوس کر رہی ہوں کہ لطیفہ، مسرت اور رضا مجھے کچھ عجیب نظروں سے دیکھتی ہیں۔ خاص طور پر مسرت۔ بڑے تکلف سے پیش آتی ہے جیسے وہ مجھ سے کچھ چھپا رہی ہو۔ میں ایسی لڑکی ہوں جسے بڑی آسانی سے خوش کیا جا سکتا ہے۔ ملاطفت کا ایک لفظ مجھے خوش کرنے کے لئے کافی ہے لیکن گل رخ کو ایسے مذاق تو نہیں کرنے چاہئیں جو ترش، تلخ اور طعن آمیز ہوں۔ اس سے مجھے دکھ ہوتا ہے۔ میں جانتی ہوں کہ میں بدصورت ہوں لیکن کسی کو میرا تمسخر تو نہیں کرنا چاہیئے۔

(۱۳)

میں کل سے بڑی افسردہ ہوں۔ میں نے گل رخ کو اس کا سبب بتایا لیکن اس نے ایسی بے رخی برتی کہ میری اذیت میں اضافہ ہو گیا۔ گھر پہنچی تو امی جان نے میرے لتے لئے اور مجھ پر کئی الزامات لگائے (۱) میں ان کی اجازت کے بغیر ایک سہیلی کے یہاں چلی گئی تھی اور ابا جان میرے انتظار میں بیٹھے رہے۔ (۲) میں نے اپنی گھڑی کھو دی تھی۔ (۳) میں دوبارہ دیر سے پہنچی (۴) میں نے امی جان سے پوچھے بغیر قیمتی شال خرید لیا۔ (۵) میں نے اپنا آویزہ اور کتابیں کھو دیں۔ (۶) میں اپنی صحت کی پروا نہیں کرتی۔ مختصر یہ کہ میں لاپروا ہوں۔ جمیلہ بھی امی جان کی ہمزبان تھی اور کہتی تھی کہ میں لوگوں پر حد سے زیادہ اعتماد کرتی ہوں۔ ہر کوئی کہتا ہے بہت سیدھی ہے۔ اس کے باوجود میں ضد کرتی ہوں۔ امی جان نے کہا تم غائب دماغ ہو اس لئے تمہیں اپنے آپ پر اعتماد نہیں کرنا چاہیئے اور اپنے آپ کو سزا دینی چاہیئے۔ شاید میری آنکھوں میں آنسو چھلک رہے تھے۔ جمیلہ نے امی جان سے کہا "اب بس کیجئے" میں باورچی خانے میں چلی گئی اور ان کے ساتھ چائے پی۔ واپس آکر گننا شروع کیا۔

میں نے ایک دفعہ کہا تھا کہ میں جان بوجھ کر بے وقوف بنتی ہوں۔ اس پر میں گل رخ کا یہ قول اضافہ کرنا چاہتی ہوں کہ میں مثالیت پسند ہوں۔ میں مثالیت پسند سے بھی کچھ زیادہ ہوں۔ میں خواب پرست ہوں۔ معمولی حقائق کی بنا پر ہوائی قلعے تعمیر کرنے لگتی ہوں جو حالات کے معمولی سے تغیر سے دھڑام سے گر پڑتے ہیں۔ میں ہر ایک سے خلوص اور نیکی کی اور اکثر سے ہمدردی اور دلی محبت کی اور چند ایک سے خصوصی محبت کی توقع رکھتی ہوں میں ان خوبیوں پر اعتماد کرنے لگتی ہوں جن کا کوئی وجود ہی نہیں ہوتا۔ چند دن ہوئے امی جان مجھے سرزنش کر رہی تھیں اور میری آنکھیں ڈبڈبا رہی تھیں جب میں نے فیصلہ کیا تھا کہ یا تو مجھے زندہ نہیں رہنا چاہیئے اور یا زندگی سے کوئی خاص توقع وابستہ نہیں کرنی چاہیئے۔ میں زندگی سے نباہ نہیں کر سکتی۔ میں جانتی ہوں کہ مجھے کسی سے رحم اور ہمدردی کی توقع نہیں رکھنی چاہیئے لیکن اس کے باوجود میں چاہتی ہوں کہ لوگ میری طرف ملتفت ہوں اور میری رہنمائی کریں۔ مجھے کسی نہ کسی کے سہارے کی ضرورت محسوس ہوتی ہے۔

امی جان اس وقت مجھ سے کہہ رہی تھیں "منہ پر گم سم سی رہتی ہے" میری بے چاری پنجابی امی یہ نہیں جانتیں کہ ان کی بیٹی دیوانگی کے کس قدر قریب ہے۔ اگر میں کسی بھی طرح مر نہ سکی تو پاگل ضرور ہو جاؤں گی۔

اس گل رخ نے آج میرا مزاج برہم کر دیا۔ میں اسے پسند کرتی ہوں۔ میں اس سے محبت کرتی ہوں شاید اس لئے کہ اس میں وہ خوبیاں ہیں جو مجھ میں نہیں ہیں۔ اگر اتفاق میں گل رخ کا دل، اس کی قوت کردار اور استقلال رائے ہوتا تو میں اس کی کنیز بن کر رہتی۔ میرا وجدان کہتا ہے کہ اس پر میرا اعتماد بیجا نہیں ہے۔ راشدہ قابل اعتماد نہیں تھا۔ میں سوچتی ہوں کہ میں دوسری لڑکیوں کو کیوں اتنا پسند نہیں کرتی۔ اس کا سبب جو میرے تحت الشعور میں ابھرتا ہے یہی ہے کہ وہ میری دسترس سے باہر ہیں۔ میں نہیں جانتی مجھے یہ احساس کیوں ہوتا ہے کہ گل رخ تک میری رسائی ہے۔ آج وہ مجھے اپنے سے بہت دور دور سی دکھائی دی۔ اور میرا دل بیٹھنے لگا۔ کیا وہ اتنی ہی احمق ہے کہ یہ نہیں جان سکتی کہ میں اپنے دل کی گہرائیوں میں کیسی بے کراں تنہائی محسوس کرتی ہوں۔ اگر مجھے زندہ ہی رہنا ہے تو میری مثال اس شکستہ کشتی کی ہو گی جو طوفانی سمندر میں ہچکولے کھاتی رہتی ہے۔ ایک افسردہ روح۔

یکہ و تنہا، کلبیت کی شکار۔

آج کل میں غیر معمولی نقاہت محسوس کرتی ہوں۔ گرما کا آفتاب اب مجھے ناگوار گزرتا ہے۔ مجھے دورانِ سر ہو گیا ہے۔ یوں لگتا ہے جیسے کسی صحرائے لق و دق میں کھو گئی ہوں، تپتی ہوئی ریت پر تنہا کھڑی ہوں، جب کہ چندھیا دینے والی روشنیاں میری بصارت کو مجروح کر رہی ہیں۔ میرے سر میں کھچی کھچی رہتی ہے۔ میرا سر تھک گیا ہے۔ مجھے آرام کی ضرورت ہے۔ مجھے لیٹ جانا چاہیے۔

امی جان کہہ رہی ہیں۔ سوتا گم ہونا بدشگونی ہے۔ کون بتائے کون سمجھائے کہ میں خود سب سے بڑا شگون ہوں، سب سے بڑی نحوست ہوں۔ اپنے لئے بھی اوروں کے لئے بھی۔ حقیقت یہ ہے کہ دنیا ایک وادیٔ خار زار ہے اور میں کس قدر ناتواں ہوں۔ "دنیا میں رہنا کانٹوں کی دلالی کرنا ہے میں بیٹا بھی ہو تو بیاہ ہو جائے"۔ امی جان کہتی ہیں کہ میں نے روپیہ کمانے سے پہلے اُسے اُڑانا سیکھا ہے۔ یہ بات خاصی پریشان کرنے والی ہے۔ میں نوکری کرنا پسند نہیں کرتی۔ میرا رنگِ طبع ہر وقت بدلتا رہتا ہے۔ میں بہت کمزور اور بے قاعدہ ہونے کے علاوہ کسی کا حکم برداشت نہیں کر سکتی۔ میں ہر وقت بیمار کی سی رہتی ہوں کہ کوئی مجھ سے پیار کرے جیسے بلی کو سہلایا جاتا ہے۔ جناب ماہرِ نفسیات! آپ ذرا بھی خیال کریں۔ میرے احساسات اس قدر گمبھیر ہیں کہ ان کا تجزیہ ممکن نہیں ہے اور میں اس قدر سیدھی سادی ہوں کہ میرا تجزیۂ نفس کیا ہی نہیں جا سکتا۔ اگر یہ ممکن ہوتا تو میں کب کی اپنا تجزیۂ نفس کر چکی ہوتی۔ مگر یہ کہتی ہے میں ریاکار ہوں۔ حقیقت یہ ہے کہ میں نیکی کرنے پر مجبور ہوں۔

جب کبھی میں فلسفے کا مطالعہ کرتی ہوں یہ خیال میرے لئے انقباض کا باعث ہوتا ہے کہ کوئی نظریہ بھی اطمینان بخش نہیں ہے۔ مجھے ان نظریات کا کوئی نہ کوئی حل تلاش کرنا ہی ہوگا۔ کیونکہ اکثر سے مجھے اختلاف ہے۔

(۱۴)

میں نے ابھی ابھی ایک خوبصورت امریکن کی عکسی تصویر دیکھی ہے جو پاکستان کے غریب لوگوں کو ٹیکے لگا رہا ہے۔ یہ دیکھ کر میں متاثر ہو گئی۔ میں بھی کیوں نہ اپنی زندگی خدمتِ خلق کے لئے وقف کر دوں۔

جب میری گھڑی کھو گئی اور آویزہ گم ہوا جو توہین آمیز باتیں مجھ سے کہی گئی تھیں وہ مجھے اب تک یاد ہیں۔ حالانکہ اس میں میرا کیا قصور ہے۔ انہیں چرانے والوں کو کوئی برا بھلا نہیں کہتا۔ مجھ پر سب ہی طعن کرتے ہیں۔ لاپروائی بے شک کرتا ہی ہے لیکن اتنا سنگین جرم تو نہیں ہے۔

میں سونے کی کوشش میں تھی کہ میرے ذہن میں ایک خیال آیا۔ میں نے کہیں کہا تھا کہ راشد نے میرے ساتھ جو بدسلوکی کی تھی اس نے میرے اندر احساسِ معصیت پیدا کر دیا تھا۔ مجھے یوں لگا جیسے میری بدسلوکی نے میرے اندر یہ احساس پیدا کیا ہے۔ میرا کیا قصور تھا سوائے اس کے کہ میں ایسے حالات کی شکار ہو گئی جو میرے لئے ناسازگار ثابت ہوئے۔ اس بارے میں وہ لوگ کیا کہیں گے جو ذمے داری کے مسئلے پر بحثیں کرتے ہیں اور جو برا کام کرنے والے کی پشیمانی کو دیکھتے رہتے ہیں۔ مجھے امید ہے کہ اللہ میاں اپنے شاندار عرش پر خوش بیٹھے ہوں گے اور راشد اپنی حسین بیوی کی صحبت میں شاداں و فرحاں ہوگا اور ہر شخص کے لئے کوئی نہ کوئی چیز مسرت بخش ہوگی۔ میں حیران ہوں کہ لوگوں نے جو ظلم و ستم مجھ پر روا رکھا ہے کیا اس کا خیال ان خوش و خرم لوگوں میں کسی کو آتا ہوگا۔ لیکن میں کیوں افسردہ ہوں۔ میں کیوں اپنے آپ کو گنہگار محسوس کرتی ہوں اور اس بات پر کیوں خجالت اور پشیمانی محسوس کرتی ہوں جو میں نے کبھی کی ہی نہیں۔

جو قصور مجھ سے سرزد ہوتا ہے میں اس پر افسوس کا اظہار کرنے کے لئے تیار ہوں۔ امی جان کے سب الزامات صحیح ہیں۔ میں پشیمان ہوں اور آئندہ محتاط رہوں گی۔ میں کسی نہ کسی دن بالضرور اپنی جان لے کر رہوں گی۔ مجھے ہمیشہ سے یہ تلخ احساس ستاتا رہا ہے کہ لوگ مجھ سے کما حقہ محبت نہیں

کرتے۔ میرا احترام نہیں کرتے۔ پھر میں سوچتی ہوں کہ اپنی صحت کو بحال کرنے کی کوشش کروں۔ یہ سب کچھ مجھی پر منحصر ہے۔ دونوں خیالات میں کوئی تضاد نہیں ہے۔ میں کوشش کروں تو صحت مند ہو سکتی ہوں۔ اس دوران میں خودکشی کا منصوبہ اپنی جگہ قائم رہے گا، اور اس کا کوئی نہ کوئی وسیلہ تلاش کرنا ہی پڑے گا۔

گل رخ اور دوسری لڑکیاں نسیمہ کے بازو کا ذکر لے بیٹھتی ہیں کہ وہ کیسا خواب ہے۔ وہ نہیں جانتیں کہ جب وہ اس کا ذکر کرتی ہیں تو میرا جی چاہتا ہے کہ بھاگ کر کہیں چھپ جاؤں۔ میرا دل بیٹھ رہا ہے۔ میں واہموں کی شکار ہو گئی ہوں۔ اٹھتے بیٹھتے، سوتے جاگتے، ہر وقت مجھے اپنی بدصورتی کا احساس رہتا ہے۔ میری سانس رک رک کر چلنے لگتی ہے۔ اگر کوئی بھانپ لے تو؛ میں کسی کو اپنی اس کمزوری کا دکھ نا پسند نہیں کرتی۔ بعض کہتی ہیں "منیرہ کس قدر حسین ہے"؟ اور میں اپنی بدصورتی کے احساس سے جو اس قدر نمایاں ہے، مر مر جاتی ہوں۔ اس کے باوجود میں نہیں چاہتی کہ کوئی شخص مجھ پر رحم کھانے لگے۔

مجھے نسیمہ کی یہ ادا بہت پسند ہے کہ وہ بڑی فراخ دل ہے۔ وہ پورے سکون سے اپنے نقلی بازو کا ذکر کرنے لگتی ہے۔ یہ بات قابل تعریف ہے۔ میں اپنے نقص کے متعلق بات کرنا چاہوں تو مجھے یوں لگتا ہے جیسے ایک صحرائے شرربار میں سے گزر کر جہنم کے دروازے میں گھسنے والی ہوں۔ اور شعلوں کی دیواروں سے اپنا سر ٹکرا رہی ہوں۔ گل رخ کہا کرتی ہے تم ناحق مطمئن دکھائی دیتی ہو لیکن میں اپنی ہی آگ میں جل رہی ہوتی ہوں۔ مجھے ہر وقت یہی اندیشہ کھائے جاتا ہے کہ نسیمہ کے بعد وہ میرا ذکر لے بیٹھیں گی۔ گل رخ بڑی مغرور اور بیگانہ وش ہو گئی ہے جس سے مجھے اور زیادہ کوفت ہوتی ہے۔ میں نہیں جانتی کہ گل رخ اور نسیمہ میں وہ کشش باہمی کیوں نہیں ہے جو میرے اور گل رخ کے مابین ہے۔ میں تو دونوں سے محبت کرتی ہوں لیکن وہ دونوں مجھ سے سنگدلی اور بے مہری کا برتاؤ کرتی ہیں۔ شاید گل رخ کو یہ بات ناگوار گزرتی ہے کہ وہ اپنی دولت کا سکہ مجھ پر جمانا چاہتی ہے۔ میں نسیمہ کی یہ بات ماننے کو تیار نہیں ہوں، اور نسیمہ خود بھی جان لے گی کہ وہ دوری تباہی تک رہی ہے۔

(۱۵)

میں اکثر سوچا کرتی ہوں کہ میں تنہا کیوں ہوں؟ لیکن دنیا میں مجھ سے بھی غریب لوگ بستے ہیں۔ میں چاہوں تو روپیہ کما سکتی ہوں لیکن مجھے اس کی چنداں ضرورت بھی نہیں ہے۔ میں زر و مال کی پروا نہیں کرتی اور ان معاملات کو کچھ اہمیت نہیں دیتی۔ اس کے باوجود جب کبھی ایسے مواقع دو چار ہوں جب مجھے تنگدستی کی وجہ سے خفیف ہونا پڑے تو مجھے بڑا صدمہ ہوتا ہے۔ امی جان کہتی ہیں تم بڑی غیر ذمے دار ہو لیکن ایسا نہیں ہے۔ بعض اوقات میں اپنے آپ کو اس غیر ذمے داری کی ذمے دار سمجھنے لگتی ہوں۔ میرے مزاج کا رنگ ہر وقت بدلتا رہتا ہے۔ میرا جی نہ چاہے تو میں کوئی کام نہیں کر سکتی۔ میرا دل افسردہ رہتا ہے۔

ہوا کے جھونکے کیسے لطیف ہیں۔ یوں لگتا ہے جیسے مجھ سے پیار کر رہے ہیں۔ مجھ پر ایک عجیب مدہوشی کی کیفیت چھا گئی ہے۔ میرا دل بظاہر پرسکون ہے لیکن میری سانس گرانبار ہے۔ لگتا ہے جیسے میرے دل میں عمیق خلا ہے۔ اُف میں کس قدر تنہا ہوں۔

پھر آج کیسی حسین رات ہے۔ یہی کیا کم زندگی ہے کہ انسان چوروں کی طرح چھپ چھپ کر رات گزارے اور اپنے آپ سے شرمسار رہے۔ اس بات کا ذکر کروں تو گل رخ صاحبہ مٹھیاں بھینچ کر اور دانت پیس کر کہیں گی اور فتویٰ صادر کریں گی "اپنے آپ کو بدصورت دیکھو اگرچہ تم بدصورت ہی ہو"۔ مجھ میں برائی یہ ہے کہ میں ڈھیٹ نہیں ہوں۔ میں ڈھیٹ ہو کر زندہ نہیں رہ سکتی اور وہ کہتی ہیں گی میں کیا کروں۔ میری سمجھ میں کچھ نہیں آتا۔ لوگ ہنستے ہیں۔ زور زور سے قہقہے لگاتے ہیں۔ میں کیسے ہنسوں۔ مجھے ہنسنا تو آتا ہے مگر یہ نہیں معلوم ہوتا کہ کس بات پر ہنسوں۔ میرا دل بیٹھا جا رہا ہے۔ معلوم نہیں کیوں؟